جون 1989ء
تعلیم و تربیت

اس شمارے میں "پُراسرار نقاب پوش" کی آخری قسط چھپی ہے۔ اب یہ ناول ختم ہُوا۔
اگلے مہینے سے جناب اے حمید کا ایک نیا دِل چسپ اور سنسنی خیز ناول "انگوٹھی کہاں گئی" قسط وار شائع کیا جائے گا۔ انتظار کیجیے۔

بِسمِ اللہِ الرّحمٰنِ الرّحیم

السّلام علیکم

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تعلیم و تربیت کا سالنامہ ہماری توقّع سے زیادہ پسند کیا گیا۔ بچّے تو بچّے، بڑوں کے بھی بے شمار تعریفی خط موصول ہُوئے، اور ابھی تک ان کا تانتا بندھا ہُوا ہے۔ ہم ان تمام دوستوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ اُنھوں نے ہماری محنت کو سراہا اور ہماری حوصلہ افزائی کی۔

اِس مہینے "پُراسرار نقاب پوش" کی آخری قسط شائع کی جا رہی ہے۔ اب یہ سیریل ختم ہُوا۔ اگلے ماہ سے جناب اے حمید کا دوسرا قسط وار ناول "انگوٹھی کہاں گئی" شائع ہوگا۔ یہ ناول پہلے ناول سے اس لحاظ سے زیادہ مُفید اور دلچسپ ہوگا کہ اِس میں نِری تفریح ہی نہیں، بلکہ ایک مقصد بھی ہے اور وہ مقصد ہے آپ کو برِصغیر کی اِسلامی تاریخ کے شان دار گوشوں سے رُوشناس کرانا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تاریخ کی کوئی خشک اور کڑوی کسیلی کتاب ہوگی۔ یہ ایک ناول ہے اور اس میں وہ تمام چٹپٹے مسالے ہوں گے جو ایک دِل چسپ اور سنسنی خیز ناول میں ہوتے ہیں۔

اور جیسا کہ ہم نے آپ کو پچھلے مہینے بتایا تھا، اس مہینے سے نیا کامک "شیر شاہ سُوری" شرُوع کیا جا رہا ہے۔ اسے لِکھا ہے ڈاکٹر عبدالرؤف نے اور خوب صُورت السٹریشنز سے سجایا ہے ہمارے آرٹ ڈائریکٹر جناب محمود حسن رُومی نے۔

اڈیٹر

فہرست مضامین

اُنچاسواں سال۔ تیسرا شمارہ

پاکستان میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا
بچّوں کا محبُوب رسالہ

چیف ایڈیٹر : عبدُالسّلام

ایڈیٹر : ظہیر سلام

سینیئر اسسٹنٹ ایڈیٹرز : مقبول انور داؤدی، ڈاکٹر عبدالرؤف

جائنٹ ایڈیٹر : سید لخت

اسسٹنٹ ایڈیٹر : محمد اقبال ثاقب

آرٹ ڈائریکٹر : محمود حسن رُومی

سرکولیشن منیجر : الطاف احمد

ایڈورٹائیزنگ منیجر : مبشر علی خان

ڈسٹری بیوشن منیجر : شہزاد اصغر

اکاؤنٹس منیجر : محمد انور بھٹی

جنرل منیجر پروڈکشن : ایم جاوید خان

منیجر پلاننگ : فاروق عالم

سرکولیشن اسسٹنٹ : محمد لشیر راہی

مطبوعہ فیروز سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور

پبلشر : ظہیر سلام

پرنٹر : عبدُالسّلام

شعبہ اِدارت و اشتہارات
32۔ شارع بن بادیس (ایمپرس روڈ) لاہور
فون :- 63090-226819

سرکولیشن اور اکاؤنٹس
60۔ شاہراہ قائدِ اعظم لاہور
فون :- 301196-97

راولپنڈی آفس
277۔ پشاور روڈ
فون :- 63503-64273

کراچی آفس
مہران ہائٹس۔ مین کلفٹن روڈ
فون :- 537730

جون 1989

قیمت فی پرچہ =/8 روپے

سرورق : شیر شاہ سُوری

سُنو رے بھیّا

عنایت علی خان

اِک کہانی سُنو رے بھیّا
میز پہ میری چڑھ گئی چُوہیا

پاس جو اِک پنسل کو پایا
جھٹ پنجوں میں آن دبایا

پنسل بولی: کاغذ بھائی
دیکھو، میری شامت آئی

جلد کوئی تدبیر بتاؤ
اِس آفت سے جان چھُڑاؤ

کاغذ نے تدبیر بتا دی
کان میں اُس کے بات سُنا دی

پنسل نے تدبیر چلائی
کاغذ پر تصویر بنائی

بُوجھو، کیا تدبیر تھی بچّو
بِلّی کی تصویر تھی بچّو

بِلّی کی تصویر جو دیکھی
چُوہیا کان دبا کر بھاگی

سُناؤں تُمھیں بات اِک رات کی
کہ وُہ رات اندھیری برسات کی
چمکنے سے جگنُو کے تھا اِک سماں
ہوا پر اُڑیں جیسے چنگاریاں
پڑی ایک "بندر" کی اُن پر نظر
پکڑ ہی لیا ایک کو دوڑ کر

بندر نے خوخیا کر کہا "بھاگ جاؤ، یہاں سے ۔ ڈرپوک کہیں کے ۔ اندھیرے سے ڈرتے ہو تو باہر کیوں نکلتے ہو"؟

"میں ڈرپوک نہیں ہوں" جگنُو نے چمک کر کہا ۔

"تُم ڈرپوک ہو" بندر غُصّے سے بولا "تمھیں اندھیرے سے ڈر لگتا ہے ۔ جب ہی تو لالٹین لیے پِھرتے ہو"۔

جگنُو نے کہا "یہ لالٹین نہیں ہے :

یہ قُدرت کی کاری گری ہے جناب
کہ ذرّے کو چمکائے جُوں آفتاب

سب جگنُوؤں کی دُمیں اندھیرے میں چمکتی ہیں"۔

بندر نے قہقہہ لگایا اور بولا "تب تو تمام جگنُو ڈرپوک ہیں ۔ وہ اندھیرے سے ڈرتے ہیں"۔

یہ کہ کر اس نے دوسرے بندروں کو آواز دی اور اُن سے کہا "جگنُو بزدل ہوتے ہیں ۔ وہ اندھیرے سے ڈرتے ہیں" ۔

تمام بندر ہنسنے لگے ۔ بعض نے مُنہ میں اُنگلیاں ڈال کر سیٹیاں بجائیں ۔ بعض بغلیں بجانے لگے ۔ ہر طرف سے "ڈرپوک ، ڈرپوک" کی آوازیں آنے لگیں ۔

جگنُو کو غُصّہ آگیا ۔ وہ چیخ کر بولا "میں کسی سے نہیں ڈرتا ۔ تُم سے بھی نہیں ڈرتا ۔ یقین نہ ہو تو میرے ساتھ مقابلہ کر لو"۔

بندر مُنہ چِڑا کر بولا "کیا پدّی کیا پدّی کا شوربا۔ بڑا آیا مقابلہ کرنے والا ۔ ارے! میں تو جنگل کے تمام جگنُوؤں کا ایک ہی مُکّے میں بُھرکس نکال دُوں گا"۔

"اچھّا تو کل اِسی وقت ، اِسی جگہ آ جانا" جگنُو نے کہا "اور اپنے سارے خان دان کو بھی لے آنا ۔ میں اکیلا تم سب کا مقابلہ کروں گا"۔

یہ بات تمام جنگل میں پھیل گئی ۔ جو سُنتا ، خوب ہنستا ۔ بھلا کہاں ایک ننّھا سا جگنُو اور کہاں موٹے تازے بندر ۔ یہ تو چیونٹی اور ہاتھی کا مقابلہ تھا ۔ جانوروں کو یقین تھا کہ بندر ایک منٹ میں جگنُو کا بھرتا بنا دیں گے ۔

دُوسرے دن شام کو جنگل کے سب جانور اُس جگہ جمع ہو گئے ۔ یہ ایک بڑا سا میدان تھا جس کے چاروں طرف گھنے درخت تھے ۔

اتنے میں خُوں خُوں کی آواز آئی اور جانوروں نے دیکھا کہ وہی

بندر ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا پکڑے آ رہا ہے ۔ اس نے چلّا کر کہا "کہاں ہے وہ جگنو کا بچّہ؟ ہمّت ہے تو سامنے آئے ۔ ایسا مزہ چکھاؤں گا کہ عمر بھر یاد رکھے گا"۔

"میں یہاں ہوں" جگنو کی آواز آئی ۔ وہ جَھم جَھم چمکتا بندر کی طرف آ رہا تھا ۔ اس نے پوچھا "اکیلے ہی آئے ہو؟ ساتھی کہاں ہیں"؟

"وہ بھی آ رہے ہیں" بندر نے کہا "وہ دیکھو"!

جانوروں نے دیکھا ، ننانوے (۹۹) بندر ، ہاتھوں میں موٹے موٹے ڈنڈے پکڑے ، میدان کی طرف آ رہے ہیں ۔

"اب جگنو کی خیر نہیں" ایک گیدڑ بولا ۔

"اِس کے لیے تو ایک ہی بندر کافی تھا" لومڑی بولی "اِتنے سارے بندر کیوں آ گئے"؟

سب جانور بڑا سا گھیرا بنا کر بیٹھ گئے اور بیچ میں جگنو اور بندروں کے لیے جگہ چھوڑ دی ۔

"ٹھہرو"! بندر بولا "پہلے کسی کو ریفری مُقرّر کر لو ۔ وہ فیصلہ کرے گا کہ کون جیتا ، کون ہارا"۔

"میں فاختہ کا نام تجویز کرتا ہوں" جگنو بولا ۔

تمام جانوروں نے ایک آواز ہو کر کہا "ٹھیک ہے ۔ ٹھیک ہے"۔

فاختہ اُڑتی ہوئی میدان میں آئی اور بولی "بندر دائیں طرف ہو جائیں اور جگنو بائیں طرف"۔

جگنو اور بندروں نے اپنی اپنی جگہ سنبھال لی تو فاختہ نے زور سے کہا "ریڈی"!

بندروں نے ڈنڈے اُوپر اُٹھائے اور حملے کے لیے تیار ہوگئے۔

"وَن ـ ـ ـ" فاختہ نے کہا ۔

بندر ڈنڈے لہراتے ہوئے دو قدم آگے آ گئے ۔

"ٹو ـ ـ ـ" فاختہ بولی ۔

بندر دو قدم اور آگے آ گئے ۔ اُن کے سامنے جگنو اُڑ رہا تھا ۔ اُس کی دُم چمک رہی تھی ۔

"تھری ـ ـ ـ" فاختہ نے زور سے کہا ۔

اور اِس کے ساتھ ہی سو کے سو بندر خُوں خُوں کرتے ، ڈنڈے لہراتے ، جگنو کی طرف دوڑے ۔ جگنو جلدی سے ایک بندر کی ناک پر بیٹھ گیا ۔ بندروں نے تاک تاک کر اُس کی ناک پر ڈنڈے مارے ۔ جگنو تو اُڑ گیا لیکن اُس بندر کی ناک کا کچُومر نِکل گیا ۔ وہ زمین پر لیٹ کر ہائے ہائے کرنے لگا ۔

جگنو اِسی طرح ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے بندر کی ناک پر بیٹھتا گیا اور بندر دھڑام دھڑام زمین پر گرتے گئے ۔

کچھ دیر بعد 99 بندر زمین پر پڑے ہائے ہائے کر رہے

تھے ۔ اب صرف ایک بندر رہ گیا تھا ۔ وہ ہاتھ جوڑ کر بولا "خُدا کے لیے مجھے مت مارنا ۔ میری توبہ! تم جو کہو گے ، میں وہی کروں گا"۔

"اچھّا" جگنو کڑک کر بولا "اِن سب جانوروں کے سامنے کان پکڑو اور وعدہ کرو کہ آئندہ کبھی مجھے ڈرپوک نہیں کہو گے"۔

"میں وعدہ کرتا ہوں" بندر نے کان پکڑ کر کہا "اب کبھی تمہیں ڈرپوک نہیں کہوں گا"۔

بس اُس دن سے تمام بندر جگنوؤں سے ڈرتے ہیں ، اور انہیں دیکھ کر ایسے بھاگتے ہیں جیسے چُوہا بلّی کو اور ہرن شیر کو دیکھ کر بھاگتا ہے ۔ یقین نہ ہو تو اندھیری رات میں کسی بندر کے پاس جگنو چھوڑ کر دیکھ لیں ۔

ماں آخر ماں ہے

میرزا ادیب

میرے بیٹے نے اپنے بچّوں کا شوق پورا کرنے کی خاطر گھر کے باغ میں ایک بڑے پنجرے کے اندر چھوٹی نسل کے طوطے پال رکھے تھے ۔ ان کا قد چڑیوں جتنا تھا اور پَر بہت خوب صورت اور رنگین تھے ۔ احسن ، لالی اور چیکو تینوں ان طوطوں سے بہت مانوس تھے ۔ احسن اور لالی تو سکول سے آتے ہی پنجرے کے پاس جا کر کھڑے ہو جاتے ۔ دیکھتے تھے کہ پنجرے کے اندر دانہ پانی ہے یا نہیں ۔ باجرا یا پانی کم ہوتا تو فوراً یہ کمی دُور کر دیتے تھے ۔

یہ طوطے صرف ہمارے گھر کے بچّوں ہی کے لیے تفریح کا ذریعہ نہیں تھے ، مُحلّے کے بہت سارے بچّے بھی ان میں بڑی دل چسپی لیتے تھے ۔ اُنہیں جب بھی فرصت ملتی ، باغ میں آ جاتے اور طوطے دیکھ کر دل بہلاتے تھے ۔

پنجرے کی جالی کافی مضبوط تھی ۔ بلّیاں پنجرے کے قریب سے گزر جاتی تھیں اور کبھی انھوں نے جالی پر پنجے نہیں مارے تھے ۔ مگر ایک رات ایک بلّی نے ایسی حرکت کی جس کی ہمیں توقع نہیں تھی ۔ اس نے نہ جانے کس طرح جالی کا ایک حصّہ توڑ ڈالا ، پنجرے کے اندر گھس گئی اور چھ طوطوں کو ہڑپ کر لیا ۔ ساتویں ایک طوطی تھی جس نے کچھ دن پہلے انڈے دیے تھے ۔ جن میں سے تین بچّے نکلے تھے ۔ پنجرے کی چھت کے نیچے ایک چھوٹی سی ٹین کی چھت بھی بنوائی گئی تھی اور یہ چھت طوطوں کے بچّوں کے لیے تھی تاکہ جب تک وہ بڑے نہ ہو جائیں اس چھت پر پرورش پائیں ۔ اور ہوتا بھی یہی تھا کہ جب بچّے بڑے ہو جاتے تھے تو چھت کو چھوڑ کر نیچے آ جاتے تھے اور پھر کبھی چھت پر نہیں جاتے تھے ۔

جب بلّی پنجرے میں داخل ہوئی تو طوطی اپنے بچّوں کے ساتھ ٹین کی چھت کے اوپر تھی ۔ وہاں تک بلّی پہنچ نہیں سکتی تھی ۔ وہ ساری رات پنجرے کے اندر رہی اور طوطی اور اس کے بچّے چھت پر بیٹھے رہے اور اس سے محفوظ رہے ۔

صبح بلّی پنجرے سے نکل کر غائب ہو گئی تھی ۔ بچّوں کو اس حادثے کا علم ہوا تو ان کے چہروں پر مُردنی چھا گئی ۔ محلّے کے بچّوں کو بھی اس کا علم ہوا تو وہ بھی آ گئے ۔ سب کے چہرے افسردہ اور پژمُردہ تھے وہ سب بلّی کو مارنے کی ترکیبیں سوچتے رہے اور اسے بد دعائیں بھی دیتے رہے ۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا ۔

اب دو مسئلوں کو حل کرنا بہت ضروری تھا ۔ ایک مسئلہ تو یہ تھا کہ پنجرے کی جالی کو مضبوط بنوایا جائے یا نئی جالی لگوائی جائے ۔

میرے بیٹے کی رائے تھی کہ اس پنجرے کی جالی ٹھیک کر لی جائے اور طوطوں کے لیے نیا گھر بنوایا جائے کیونکہ بلّی ایک بار حملہ کر چکی ہے اور وہ آیندہ بھی حملے کرتی رہے گی ۔ جالی کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو بار بار کی کوشش سے اسے توڑا جا سکتا ہے ۔

یہ مسئلہ تو ضروری تھا مگر دوسرا مسئلہ اس سے زیادہ ضروری تھا

اور یہ مسئلہ یہ تھا کہ پنجرے میں تنہا طوطی بُہت پریشان ہوگی ۔ اس کے لئے نئے ساتھی لانے ہوں گے تاکہ وہ گھر جو ویران ہو چکا ہے اس کی رونق واپس آجائے ۔

میرے بیٹے کی رائے تھی کہ پہلے طوطوں کے لئے نیا گھر بنوایا جائے پھر مارکیٹ جاکر نئے طوطے خریدے جائیں ۔ یہ رائے درست تھی ۔ چنانچہ نیا گھر بنوانے کی تیاریاں ہونے لگیں ۔

نیا گھر ایسی جگہ بنایا گیا جہاں بِلّیاں نہیں آسکتی تھیں ۔ کیونکہ یہ جگہ ہر وقت گھر والوں کے سامنے رہتی ہے ۔ گھر بن گیا تو اب طوطی اور اس کے بچّوں کو اس میں داخل کرنا ضروری تھا ۔ بد قسمتی یہ ہوئی کہ وہ دو لڑکے جو پنجرے کی ٹوٹی ہوئی جالی کی جگہ نئی جالی لگا رہے تھے انہوں نے پنجرے کا دروازہ کھول دیا ۔ وہ بھول گئے کہ پنجرے کے اندر ایک طوطی اور اس کے بچّے موجود ہیں ۔

پرندہ آزاد فضاؤں میں رہنا چاہتا ہے ۔ اس کی خواہش ہوتی ہے کہ آزادی کے ساتھ اڑتا پھرے ۔ جہاں جی چاہے چلا جائے ۔ پنجرے کی پابندی اسے کسی صورت بھی قبول نہیں ہوتی ۔ اب جو طوطی نے پنجرے کا دروازہ کھلا دیکھا تو پُھر سے اڑ کر نہ جانے کہاں غائب ہوگئی ۔

اصل اور بڑا مسئلہ تو اب پیدا ہوا تھا طوطی اپنے تین چھوٹے چھوٹے بچّے چھوڑ گئی تھی ۔ ان کی پرورش کیسے کی جائی؟ یہ بہت بڑا مسئلہ تھا بچّے ٹکریوں میں بٹ گئے اور اس اہم مسئلے پر غور کرنے لگے ۔ چند بچّوں کی رائے تھی کہ بازار سے نئے طوطے لے آئیں ۔ ان میں جو طوطیاں ہوں گی وہ ان بچّوں کی پرورش کر لیں گی ۔ مگر بزرگوں نے اس مشورے کو اس وجہ سے پسند نہیں کیا کہ پرندوں میں بھی کسی کی اولاد کو پالنے کا دستور نہیں ہے ۔ یہاں بھی بچّوں کی ماں ہی اپنے بچّوں کو پالتی ہے ۔ دوسرے پرندوں کی ماں نہیں ۔

دوسرے بچّوں کی رائے تھی کہ طوطی واپس آجائے گی ۔ اس لئے پنجرے کا دروازہ کھلا رکھا جائے ۔ مگر اس میں خطرہ یہ تھا کہ اگر طوطی کی بجائے بلّی داخل ہوگئی تو کیا ہوگا ؟ وہ تو ان ننھے منّے بچّوں کو فوراً کھا جائے گی ۔ یہ مشورہ بھی رد کر دیا گیا ۔

دیر تک گھر کے بزرگ اور بچّے طوطی کے بچّوں کو پالنے کے سلسلے میں بحث کرتے رہے مگر کوئی مشورہ اتفاقِ رائے سے منظور نہ ہو سکا ۔ ہر شخص سوچ رہا تھا کہ کیا کِیا جائے ۔ ادھر بچّوں کو دیکھ دیکھ کر ہر ایک کو دکھ ہو رہا تھا ۔ یہ معصوم جانیں کیسے زندہ رہ سکتی ہیں ؟

میرے بیٹے نے باجرے کے دانوں کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کر کے انہیں بچّوں کے مُنہ میں ڈالنے کی کوشش کی ۔ اِسی طرح پانی بھی دیا ۔ لیکن یہ کوشش کامیاب ہوتی دِکھائی نہ دی ۔

احسن کی ماں بولی "بچّوں کو پالنا کوئی آسان کام نہیں ہے ۔ صرف ماں ہی بچّوں کو پال سکتی ہے اور کوئی نہیں"۔ انہوں نے درست کہا تھا ۔ مگر بچّوں کی ماں تو تھی نہیں ، اور بچّوں کو پالنا بھی ضروری تھا ۔ کیا تدبیر کی جائے؟ اس بار پھر مشورے ہونے لگے ۔ لیکن احسن کی امّی نے جو کچھ کہا تھا وہی درست تسلیم کیا گیا ۔ احسن کے ابّو کی رائے تھی "طوطی اپنے بچّوں کی خاطر آئے گی ضرور ۔ مگر جب تک وہ نہیں آتی ، ان معصوم بچّوں کا کیا کِیا جائے"؟

شام ہونے والی تھی اور ابھی تک مسئلہ حل نہیں ہو سکا تھا۔ احسن کے ابّو نے اپنے طرف سے ہر ممکن کوشش کی کہ بچّوں کے

پیٹ میں کچھ چلا جائے اور وہ ایک حد تک اپنے مقصد میں کامیاب بھی ہو گئے مگر مسئلہ حل نہیں ہو سکا ۔

احسن ، لالی اور محلّے کے ایک بچّے نے یہ منصوبہ بنایا کہ ہم ساری رات جاگیں گے اور پنجرے کے پاس بیٹھے رہیں گے ۔ طوطی آئے گی تو پنجرا کھول دیں گے۔

احسن کی ماں نہیں مانی ۔ اس نے کہا "یہ نہیں ہو سکتا"۔

"ضرور ہو گا" احسن نے پورے اعتماد کے ساتھ کہا ۔

محلّے کے اور بچّوں کو اس شان دار منصوبے کا علم ہوا تو وہ بھی رات بھر جاگنے کے لیے باغ میں آ بیٹھے ۔ شام رات میں تبدیل ہونے لگی ۔ اندھیرا پھیل گیا۔ لڑکے آنکھیں کھولے باغ کے اندر پنجرے سے کچھ دور بیٹھے تھے ۔ باغ میں بلب کی روشنی کافی تھی ۔ اس پر بھی انہوں نے ایک لالٹین جلا کر اپنے پاس رکھ لی تھی ۔

آٹھ بجے ٹیلی ویژن سے کوئی ڈراما ٹیلی کاسٹ ہونے والا تھا ۔ دو لڑکے یہ کہ کر چلے گئے کہ ہم ڈراما دیکھ کر واپس آ جائیں گے ۔ مگر وہ نہ آ سکے ۔ دو بچّوں کی مائیں انہیں لینے کے لئے آ گئیں ۔ اب صرف احسن اور لالی رہ گئے ۔ کچھ دیر تو وہ جاگتے رہے مگر جب ان کی ماں انہیں دیکھنے کے لئے آئی تو دونوں کے سر جھکے ہوئے تھے ۔

"چلو ، اندر چل کر سو جاؤ ۔ صبح سکول جانا ہے"۔ احسن اور لالی اٹھنا نہیں چاہتے تھے ۔ مگر ان کی امّی انہیں اپنے ساتھ لے گئی ۔

صبح سویرے میرا بیٹا باغ میں گیا ۔ لالٹین جل رہی تھی ۔ احسن اور لالی کی ماں اُسے بجھانا بھول گئی تھی اس نے لالٹین بجھائی اور یوں ہی پنجرے کے پاس چلا گیا۔

ہیں! یہ کیا؟ پنجرے کے اوپر طوطی بیٹھی تھی!

ابھی وہ طوطی کو دیکھ ہی رہا تھا کہ احسن اور لالی بھی آ گئے ۔ انہوں نے بھی طوطی کو دیکھ لیا تھا ۔ احسن اور لالی کی ماں بھی آ گئی ۔

"یہ کیسے زندہ رہی؟ بلّی تو اسے ایک منٹ میں ہڑپ کر سکتی تھی" وہ بولی ۔

"پتا نہیں کب آ کر بیٹھ گئی" احسن اور لالی کے ابُو نے کہا۔ "شام کے وقت آ گئی ہو گی اور ساری رات بیٹھی رہی ۔ جان کی بھی پروا نہیں کی"۔

احسن اور لالی کی ماں بولی "ماں آخر ماں ہے"۔

پنجرے کا دروازہ کُھلا تو طوطی ایک لمحے میں اندر چلی گئی۔

آیئے، مُسکرائیں

ایک شخص سائن بورڈ بنوانے ایک پینٹر کے پاس گیا، اور اُس سے کہا سائن بورڈ پر یہ عبارت لکھنا:

"ضمیر الدّین کُتب فروش"

دوسرے دن وہ سائن بورڈ لینے گیا تو اُس پر لکھا ہوا تھا:

"کُتبُ الدّین ضمیر فروش"۔ (خالد آفریدی)

گڈّو میاں اپنی خالہ کے ہاں دعوت میں گئے ۔ کھانا کھا چکے تو خالہ نے کہا "بیٹا، شرماؤ مت ۔ اور کھاؤ"۔

گڈّو میاں بولے "بس خالہ جان ، منہ تک پیٹ بھر گیا ہے ۔ اب جگہ نہیں ہے"۔

خالہ بولیں "اچھا تو یہ تھوڑے سے انگور جیب میں رکھ لو"۔

گڈّو میاں بولے "شکریہ ، خالہ جان ۔ جیبیں بھی منہ تک بھری ہوئی ہیں"۔ (سُنبل اشرف ، گوجرانوالہ)

ایک عورت نے سونے کے بُندے خریدے ۔ وہ سوچنے لگی کہ لوگوں کو یہ بُندے کیسے دکھاؤں ۔ آخر اُسے ایک ترکیب سُوجھی ۔ اُس نے اپنے گھر کو آگ لگا دی اور چیخ چیخ کر کہنے لگی: ہائے! میں برباد ہو گئی ۔ تباہ ہو گئی ۔

لوگوں نے آ کر پوچھا "کیا ہوا"؟ عورت کہنے لگی "ہائے! میرا سب کچھ تباہ ہو گیا۔ صرف یہ بُندے بچے ہیں"۔

(محمد عاقل احمد خان ۔ پرانا سکھر)

یہ پانچ مختلف کھیلوں کی تصویریں ہیں۔ ہر تصویر کے نیچے ایک مشہور کھلاڑی کا نام درج ہے ۔ لیکن تمام نام غلط جگہ دیے گئے ہیں ۔ آپ ہر کھلاڑی کا نام صحیح تصویر کے نیچے لکھیے اور پھر اپنے ابُّو یا بھائی جان کو دکھائیے ۔

1 ________

2 ________

3 ________

4 ________

5 ________

کامران موت کے منہ میں

آخری قسط

نیلے سانپ کو کامران کی فکر ہوئی۔ اُسے کھنڈر کی طرف گئے دو دن ہو گئے تھے۔ نیلے سانپ کو شبہ تھا کہ کامران ضرور کھنڈر کی طرف ہی گیا ہو گا۔ وہ دوپہر کے بعد بادلوں کی چھاؤں میں موئن جودڑو کے جُنوبی کھنڈر کی طرف رینگنے لگا۔ سب سے پہلے وہ یہ تسلّی کرنا چاہتا تھا کہ سپیرے نے کھنڈر کے باہر جو لکیر کھینچ رکھی تھی، وہ بے اثر ہوئی ہے یا نہیں۔ یہ بات نیلے سانپ کے ذہن میں تھی کہ تین راتیں گُذر چکی ہیں اور سپیرا چلّہ کر کے، دیوی کا ہار لے کر وہاں سے چلا گیا ہو گا اور اُس کے جانے کے بعد یکسر طلسم اپنے آپ ختم ہو گیا ہو گا۔

نیلے سانپ نے کھنڈر کے قریب پہنچ کر زمین پر کھینچی ہوئی لکیر کو دیکھا۔ اِس لکیر کو سپیرے نے جاتے ہوئے تین چار جگہوں سے مِٹا دیا تھا۔ نیلا سانپ مطمئن ہو گیا اور لکیر کو پار کر گیا۔ اب اس نے تیزی سے رینگنا شروع کیا۔ وہ کھنڈر کے تہہ خانے میں آیا تو دیکھا کہ تہہ خانے میں دِیا ابھی تک روشن تھا اور فرش پر ایک سوراخ کے پاس ایک کالا سانپ پتّھر بنا پڑا تھا۔ نیلا سانپ سمجھ گیا کہ سپیرا دیوی کا مقدّس ہار لے کر فرار ہو گیا ہے اور ناگن راگنی دیوی کی بد دُعا سے پتّھر ہو گئی ہے۔ پتّھر ناگن کو پھر سے زندہ کرنے کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا۔ وہ کامران کو تلاش کرنے لگا، کہ کہیں وہ نیک دِل لڑکا بھی پتّھر نہ بن گیا ہو، نیلا سانپ جب دوسرے تہہ خانے میں گیا تو کامران کو زمین پر بے ہوش پڑے دیکھا۔

نیلے سانپ نے اپنا مُنہ کامران کے جسم کے ساتھ لگایا، اسے فوراً پتا چل گیا کہ اس پر سپیرے کی طلسمی لکیر کا اثر ہوا ہے اور اب یہ شام سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔ طلسمی منتر کی رُو سے کامران کو شام سے پہلے ہوش نہیں آسکتا تھا۔ نیلا سانپ سوچنے لگا کہ اسے کیا کرنا چاہئے ۔ اُسے کامران سے ہمدردی ہو گئی تھی کہ وہ محض ایک ناگن سانپ کی جان بچانے کے لئے موت کے منہ میں کُود گیا تھا۔ وہ کھنڈر سے نکل کر سیدھا موئن جودڑو کے کھنڈروں کے ایک غار میں آگیا۔ یہاں ان تاریخی کھنڈروں کا ایک بوڑھا سانپ رہتا تھا۔ نیلے سانپ نے اُسے سلام کیا اور ساری کہانی بیان کی ۔ بوڑھا سانپ غور سے سُنتا رہا، پھر بولا:

"اُس نیک دِل لڑکے نے ہماری ناگن راگنی سانپ کو بچانے کے لئے اپنی زندگی خطرے میں ڈال دی ہے۔ اُسے بچانا ہمارا فرض ہے"۔

نیلے سانپ نے کہا ۔ "اور ناگن کا کیا ہو گا؟ وہ تو دیوی کی بد دُعا سے پتّھر بن چکی ہے ۔"

اس پر بُوڑھا سانپ کہنے لگا ۔ "دیوی کی طاقت ہم سے بہت زیادہ ہے۔ ہمارے پاس اُس کی بد دُعا کا کوئی توڑ نہیں ہے ۔ اس پر بعد میں غور ہو سکتا ہے۔ تم میرا منکا لے جاؤ اور اُس نیک دِل لڑکے کے جسم پر رگڑو۔ وہ فوراً ہوش میں آجائے گا"۔

نیلے سانپ نے ایسا ہی کیا۔ اس نے کامران کے جسم پر منکا رگڑا تو اُس نے آنکھیں کھول دیں اور اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے نیلے سانپ کو اپنے سامنے دیکھا تو پہلا سوال یہ کیا کہ ناگن راگنی کہاں ہے؟

نیلے سانپ نے بتایا کہ ناگن راگنی ساتھ والے تہہ خانے میں پتّھر

بن چکی ہے اور سپیرا دیوی کا مقدّس ہار لے کر رفو چکّر ہو گیا ہے۔
کامران نے اپنا سر پکڑ لیا۔ پھر جلدی سے اُٹھ کر ساتھ والے تہہ خانے میں آ گیا۔ ناگن راگنی سانپ کی شکل میں کُنڈلی مارے فرش پر بیٹھی تھی۔ مگر وہ پتھر بن چکی تھی۔ کامران نے پُوچھا ۔ "کیا دیوی کی بد دُعا کا کوئی توڑ نہیں ہو سکتا"؟۔
نیلا سانپ کہنے لگا ۔ "اسے لے کر میرے ساتھ ہمارے گرو سانپ کے پاس چلو۔ انہوں نے کوئی ترکیب سوچنے کا وعدہ کیا ہے"۔
کامران نے ناگن کو اُٹھا لیا اور نیلے سانپ کے ہمراہ اس نیم اندھیرے غار میں آ گیا جہاں بوڑھا گرُو سانپ رہتا تھا ۔ کامران کے جسم سے نکلتی ناگ دیوتا کی خُوشبو کو محسوس کرتے ہی گُرو سانپ بِل میں سے باہر نکل آیا۔ اُس نے کامران کو خوش آمدید کہا اور بولا ۔ "عظیم ناگ دیوتا کے بھائی! مجھے نیلے سانپ نے ساری کہانی سُنا دی ہے"۔
کامران نے کہا ۔ "گُرو سانپ! کسی طرح سے میری دوست ناگن راگنی کو پھر سے زندہ کر دو ۔ اُس نے دیوی کا مقدّس ہار سپیرے کے منتروں کے اثر کی وجہ سے نکالا تھا۔ اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں"۔
گُرو سانپ بولا ۔ "مجھے معلوم ہے۔ مگر دیوی کی بد دُعا کا اثر تو اُسی پر ہوتا ہے جو اس کے مُقدّس ہار کو چُراتا ہے"۔
کامران نے نا اُمید ہو کر پوچھا ۔ "کیا ایسا کوئی طریقہ نہیں کہ ناگن راگنی پر سے دیوی کی بد دُعا کا اثر ختم ہو جائے"؟
بوڑھے گُرو سانپ نے کُچھ سوچ کر کہا ۔ "صرف ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ کسی طرح سپیرے سے دیوی کا مقدّس ہار واپس لا کر اس تہ خانے میں رکھ دیا جائے"۔
کامران بولا ۔ "لیکن سپیرا تو ہار لے کر خُدا جانے کہاں کا کہاں نکل چُکا ہو گا۔ میں اُسے کہاں تلاش کروں"؟
گرو سانپ نے کہا ۔ "یہ میں تُمہیں بتا دیتا ہوں کہ وہ اِس وقت کہاں ہے"۔
یہ کہہ کر اُس نے اپنا پھَن جُھکا دیا۔ دس سیکنڈ بعد اس نے پھَن اُٹھایا اور کہنے لگا ۔ "مقدّس ہار اب سپیرے کے پاس بھی نہیں ہے ۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جنگل میں اسے ڈاکوؤں نے پکڑ کر اس سے ہار چھین لیا اور اسے ہلاک کر ڈالا"۔

کامران نے چونک کر کہا ۔ "سپیرا مر گیا تو اب ناگن کا کیا ہو گا؟"
گرو بولا ۔ "بد معاش اور لالچی سپیرے کو اُس کے لالچ کی سزا مل گئی ہے۔ اب اگر کسی طرح ڈاکوؤں سے مقدّس ہار چھین کر واپس دیوی کے تہ خانے رکھ دو تو ناگن رانی پھر سے زندہ ہو جائے گی۔ اس کے سِوا مجھے کوئی راستہ نظر نہیں آتا"۔
کامران نے کہا ۔ "وہ ڈاکو اس وقت کہاں ہیں؟"
گُرو سانپ نے ایک دفعہ پھر گردن جُھکا لی۔ پھر گردن اٹھائی اور بولا ۔ "وہ بڑے قاتل اور وحشی قسم کے ڈاکو ہیں۔ انہوں نے یہاں سے سو میل اندر کی طرف ایک گھنے اور خطرناک جنگل میں پڑاؤ ڈال رکھا ہے، جہاں وہ رات گذاریں گے۔ مگر تم ایک کمزور لڑکے ہو۔ اُن خوف ناک ڈاکوؤں کا مُقابلہ کیسے کرو گے؟"
کامران نے کہا ۔ "میرا خُدا میرے ساتھ ہے ۔"
گرُو سانپ بولا ۔ "اس میں کوئی شک نہیں ۔ لیکن انسان کو اسکے باوجُود اپنی عقل اور ہمّت سے بھی کام لینا چاہئے ۔"
کامران خاموش ہو گیا۔ ناگن راگنی، جو پتھر بنی ہوئی تھی، سانپ کی شکل میں اس کے ہاتھ میں تھی۔ نیلے سانپ نے کہا ۔ "گرو! میں اس کے ساتھ جاتا ہوں۔ کم از کم دو تین ڈاکوؤں کو تو میں ڈس کر ہلاک کر سکتا ہوں"۔
گُرو سانپ کہنے لگا ۔ "میری طرف سے تمہیں اِجازت ہے مگر وہ ڈاکوؤں کا پُورا گروہ ہے۔ اور اُس جنگل میں جتنے بھی سانپ رہتے ہیں، ایک جوگی کی بد دُعا سے اُن سب کے زہر بے اثر ہو گئے ہیں۔ وہ سانپ تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکیں گے ۔"
کامران نے کہا ۔ "میں اور نیلا سانپ اُن ڈاکوؤں کے لئے کافی ہوں گے"۔
گُرو سانپ بولا ! "یہ تمہارا جذبہ ہے جس کی میں تعریف کروں گا۔ اب میں تمہیں اس جنگل میں جانے کا راستہ بتاتا ہوں۔"
گُرو سانپ نے کامران اور نیلے سانپ کو اچھّی طرح سے سمجھا دیا کہ جس جنگل میں ڈاکوؤں نے ڈیرا ڈال رکھا ہے ، وہاں انہیں کس طرف سے ہو کر جانا ہو گا۔ کامران اور نیلے سانپ نے گُرو سانپ کو سلام کیا اور موئن جو دڑو کے کھنڈروں سے نکل کر اپنی منزل کی طرف روانہ ہو گئے۔
کامران نے اپنی جیکٹ کی ایک جیب میں ناگن کی پتھر بنی ہوئی مُورتی کو اور دوسری جیب میں زندہ نیلے سانپ کو چھپا لیا تھا ۔ پکّی

سڑک پر آکر اسے ایک لاری مِل گئی جس نے اُسے شام ہونے سے کچھ دیر پہلے اُس علاقے میں پہنچا دیا جہاں سے آگے خطرناک جنگل شروع ہوتا تھا۔ کامران کے پاس کچھ پیسے اور ایک شکاری چاقو بھی تھا۔ سُورج غروب ہو رہا تھا۔ دُور تک کھیت پھیلے ہُوئے تھے۔ ایک گاؤں کے کچّے مکانوں میں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ دُور کسی مسجد سے اذان کی آواز آئی تو کامران نے خدا کو یاد کر کے دعا مانگی کہ وہ اُس کی حفاظت کرے، ناگن راگنی بھی زندہ ہو جائے اور اُسے اُس کا پُراسرار نقاب بھی مل جائے تاکہ وہ اُس کی مدد سے مُلک کو جرائم پیشہ غُنڈوں اور بدمعاشوں سے پاک کر سکے۔ کھیتوں میں چلتے چلتے آخر جنگل کا کنارہ آگیا۔

یہاں کھیت ختم ہو جاتے تھے اور آگے جنگل شروع ہو جاتا تھا۔ کامران نے ایک چھوٹی سی ندی پار کی اور اللہ کا نام لے کر جنگل میں داخل ہو گیا۔ اُسے سانپ بچھو کا تو کوئی ڈر نہ تھا لیکن جنگلی رِیچھ اور بھیڑیے کا ضرور خطرہ تھا۔ جنگل میں شام کا اندھیرا پُوری طرح سے نہیں چھایا تھا۔ وُہ گرو سانپ کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ رات ہونے سے پہلے پہلے ڈاکوؤں کے ڈیرے کے پاس پہنچ جائے۔ درختوں پر پرندے بسیرا کرنے آگئے تھے اور بول رہے تھے۔ راستے میں ایک پُرانا تالاب آیا تو کامران رُک گیا۔ اس نے نیلے سانپ کو جیب میں سے نکال کر اپنی کلائی کے گرد لپیٹ لیا تھا۔ اس نے نیلے سانپ سے کہا:

"گُرو سانپ نے اِسی تالاب کا بتایا تھا کہ اس سے ایک فرلانگ جُنوب کی طرف کیکر کے درختوں کے جُھنڈ میں ڈاکوؤں نے اپنا ڈیرا

لگایا ہوا ہے"۔

نیلا سانپ بولا! "ہاں، یہی وہ تالاب ہے اب ہمیں بڑی ہوشیاری سے کام لینا ہو گا۔ سیدھے جانے کی بجائے پیچھے سے ہو کر درختوں کی طرف بڑھو"۔

کامران نے اپنا رُخ بدل لیا۔ اب وہ دُوسری طرف سے ہو کر کیکر کے درختوں کے جُھنڈ کی طرف بڑھنے لگا۔ یہ جُھنڈ رات کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں اُسے دُور ایک پہاڑی کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ جب وُہ جُھنڈ قریب آیا تو کامران کو درختوں میں سے ہلکا ہلکا دُھواں اُٹھتا نظر آیا۔ اس نے نیلے سانپ سے کہا۔ "یہاں ڈاکو موجود ہیں۔ انہوں نے اندر آگ جلا رکھی ہے"۔

نیلا سانپ بولا۔ "اب اِن جھاڑیوں کی آڑ لے کر چلو۔ کوئی نہ کوئی ڈاکو یہاں ضرور پہرا دے رہا ہو گا"۔

کامران جُھک کر، جھاڑیوں کے پیچھے سے ہو کر، آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ اب اندھیرا ہو چکا تھا۔ کامران ایک جھاڑی سے نکل کر آگے گیا تو اچانک کیا دیکھتا ہے کہ وہاں ایک قبر بنی ہوئی ہے جس کے سرہانے دِیا روشن ہے۔ قبر پر پُھولوں کے ہار پڑے تھے۔ جو باسی ہو گئے تھے۔ اُس کے ہاتھ بے اِختیار فاتحہ کے لئے اُٹھ گئے۔ وہ مسلمان تھا اور ایک مسلمان پر واجب ہے کہ قبر دیکھے تو مرحوم کے لیے وہ اللہ کے حضُور مغفرت کی دُعا ضرور کرے۔ کامران نے فاتحہ پڑھ کر یونہی قبر پر سے گلاب کا ایک باسی پُھول اُٹھا کر جیب میں ڈال لیا اور پھر ڈاکوؤں کے ڈیرے کی طرف بڑھنے لگا۔ جس جیب میں اس نے گُلاب کا باسی پھول ڈالا تھا، اُس میں پتھر بنی ناگن راگنی تھی۔

اب اُسے ڈاکوؤں کے ہنسنے بولنے کی آوزیں آنے لگی تھیں۔ وہ سانس روک کر، پُھونک پُھونک کر قدم اٹھانے لگا۔ اندھیرے میں وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ اچانک پیچھے سے کسی نے اُس کی گردن پر رائفل کی نالی رکھ دی اور کرخت آواز میں کہا:

"اگر ذرا بھی حرکت کی تو گولی مار دوں گا"۔

کامران وہیں رُک گیا۔ یہ ڈاکوؤں کا ساتھی تھا جو کمین گاہ کے باہر پہرا دے رہا تھا۔

"کون ہو؟" ڈاکو نے گرج دار آواز میں پوچھا۔

کامران نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "میں، میں جنگل میں راستہ بُھول گیا ہوں"۔

ڈاکو نے بُلند آواز سے کہا "او شیرے! پولیس کا جاسُوس پکڑ

لیا ہے میں نے"۔ یہ کہہ کر وہ کامران کو ڈیرے کی طرف گھسیٹنے لگا۔ اسی دوران میں کامران کی جیب میں سے نیلا سانپ اُچھل کر باہر آیا اور اُس نے ڈاکو کو ڈس دیا۔ ڈاکو نے اس پر فائر کر دیا۔ دھماکے کی آواز سن کر ڈاکو اس طرف دوڑے ۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر کامران بھی ایک طرف کو بھاگا۔ مگر سامنے سے آتے ہوئے ڈاکوؤں نے اس پر ٹارچ کی روشنیاں ڈال کر وہیں دبوچ لیا۔ پہرے دار ڈاکو نیلے سانپ کے کاٹنے سے مرچکا تھا۔ ڈاکوؤں کے سردار نے رائفل کمر سے اتار لی اور بولا "کیا سانول بچ گیا؟"

ایک ڈاکو نے کہا "نہیں سردار۔ سانول کو سانپ نے کاٹا ہے ۔ اُس کا بدن نیلا پڑ گیا ہے ۔ ناک منہ سے خون بہہ رہا ہے۔"

سردار کامران کی طرف لال لال آنکھیں نکالتے ہوئے غُرّایا۔ "کون ہو تُم؟" "یہ سانپ کہاں سے آگیا تھا؟"

کامران نے خوف اور دہشت پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا ۔ "مجھے کچھ معلوم نہیں کہ سانپ کہاں سے آگیا۔ میں خود اس سے جان بچا کر بھاگا تھا کہ راستہ بھول کر اِدھر آنکلا۔"

سردار نے اپنے مضبوط چوڑے ہاتھ سے کامران کی گردن اتنے زور سے دبائی کہ اُس کی آنکھیں باہر نکل آئیں ۔ سب ڈاکوؤں نے کامران کو گھیر لیا تھا ۔ ان کی رائفلیں اندھیرے میں چمک رہی تھیں۔ ایک ڈاکو نے چلّا کر کہا:

"سردار یہ لڑکا پولیس کا جاسوس ہے اِسے فوراً گولی مار دو!"

سردار نے کہا "اسے ڈیرے پر لے چلو وہاں چل کر پہلے اِس سے پوچھ گچھ کریں گے پھر گولی مار دیں گے"۔

ڈاکو کامران کو گھسیٹتے ہوئے ڈیرے پر لے گئے۔ یہ ڈیرہ درختوں کے درمیان جھونپڑیاں بنا کر لگایا گیا تھا۔ پچاس کے قریب ڈاکو تھے۔ جھونپڑیوں کے اندر لالٹینیں جل رہی تھیں۔ باہر چُولہوں پر گوشت بھُونا جا رہا تھا۔ کامران کو ایک درخت کے ساتھ رسّی سے باندھ دیا گیا اُس کو یقین تھا کہ نیلا سانپ اسکی مدد کو ضرور پہنچے گا۔ درختوں پر لالٹینیں لٹکی ہوئی تھیں۔ جن کی وجہ سے وہاں کافی روشنی تھی۔ ڈاکوؤں کا سردار سامنے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ باقی ڈاکو رائفلیں لئے اُس کے اِرد گِرد بیٹھ گئے۔ کامران بالکُل سامنے درخت سے بندھا ہوا تھا۔ ڈاکوؤں کے سردار نے رائفل تان لی اور اُس سے کڑک کر پوچھا:

"تمہیں پولیس نے کس جگہ سے یہاں بھیجا ہے؟"

کامران نے کہا! "میں قسم کھاتا ہوں کہ مجھے پولیس نے نہیں بھیجا۔"

سردار نے کہا! "تم ابھی بتا دو گے۔ مجھے زبان کھُلوانی آتی ہے"۔

اس نے اپنے ایک ڈاکو کو حکم دیا کہ درخت کے ارد گرد آگ جلا دو۔ اسی وقت ایک ڈاکو اُٹھا اور اس نے اِدھر اُدھر سے سوکھی لکڑیاں لا کر کامران کے آگے پیچھے آگ لگا دی۔ سوکھی لکڑیوں نے جلد ہی آگ پکڑ لی۔ کامران سمجھ گیا کہ اب خدا ہی چاہے تو اُسے بچا سکتا ہے ورنہ بچنا ناممکن تھا۔ آگ آہستہ آہستہ شعلے بن رہی تھی اور یہ شعلے

کامران کی طرف لپکنے لگے تھے۔ اُسے آگ کی تپش محسوس ہو رہی تھی ۔ سردار غصے سے چلایا:

"اب بھی بتا دو۔ تمہیں پولیس نے کس جگہ سے بھیجا ہے اور تمہارے ساتھ اور کون کون ہے۔"

کامران نے پھر کہا مجھے پولیس نے نہیں بھیجا میں راستہ بھول کر ادھر آگیا ہوں ۔ آگ کے شُعلے بلند ہو رہے تھے کہ اچانک سردار کی چارپائی کے پاس ایک ڈاکو چیخ اُٹھا! "سانپ! سانپ!"

ڈاکوؤں کا سردار اُچھل کر ایک طرف ہو گیا اور اس نے زمین پر رائفل سے فائر کر دیا پھر قہقہہ لگا کر بولا۔ مار دیا سانپ کو!

دوسرے ڈاکو نے رائفل کی نالی پر سانپ کو اُٹھا لیا اور بولا! "سردار! یہ نیلا سانپ تھا"۔

کامران کا چہرہ اُتر گیا۔ اسکی آخری اُمید بھی ٹوٹ گئی۔ جس نیلے سانپ سے اسے مدد کی اُمید تھی اسے بھی ہلاک کر دیا گیا تھا۔ ڈاکوؤں کا سردار نیلے سانپ کے کٹے پھٹے جسم کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک کامران کو ایک سانپ کی آواز سُنائی دی۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ یہ ناگن راگنی کی آواز تھی وہ کہہ رہی تھی "کامران ! کامران!

کامران نے سانپ کی زبان میں ہلکی سیٹی بجا کر پوچھا "ناگن راگنی کیا تم زندہ ہوگی ہو؟"

ناگن راگنی کی سانپ ایسی آواز آئی "ہاں کامران ۔ میں پتّھر کی نہیں رہی ۔ تم نے قبر سے جو گُلاب کا باسی پھول اُٹھا کر جیب میں ڈالا تھا، یہ اس پھول کا اثر ہے کہ مجھ میں جان پڑ گئی ہے۔"

کامران نے سانپ کی زبان میں کہا۔ "خدا کے لئے میری مدد کرو ۔ یہ ڈاکو مجھے آگ میں زندہ جلا رہے ہیں۔"

ناگن کی آواز آئی "فکر نہ کرو۔ میں باہر نکل رہی ہوں"

ناگن نے سانپ کی شکل میں کامران کی جیب میں سے باہر چھلانگ لگا دی۔ اس وقت ڈاکو نیلے سانپ کو زمین پر رکھ کر پاؤں سے باری باری کچل رہے تھے۔ ڈاکو سردار آگ کے شعلوں کو بلند ہوتے دیکھ قہقہے لگا رہا تھا۔ شعلے کامران کے قریب سے قریب ہوتے جا رہے تھے۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ سانپ نے آگ سے باہر چھلانگ لگائی ہے۔

ناگن گھاس پر گری اور گرتے ہی اس نے پُھنکار ماری ۔ پھر وہ لڑکی کی شکل میں آگئی۔ وہ درخت کی اوٹ میں تھی۔ اس نے اپنی قمیص کے اندر سے پراسرار کراماتی نقاب نکال کر کامران کی طرف

اُچھال دیا۔ ڈاکوؤں کی نظر ایک سُنہری بالوں والی لڑکی پر پڑی تو وہ اُس کو پکڑنے کے لئے آگے بڑھے۔ ناگن راگنی کو ڈاکوؤں کے سردار نے دیکھا تو چلّایا: "یہ بھی پولیس کی جاسوس ہے۔ اسے بھی پکڑ لو!

ڈاکوؤں نے ناگن راگنی کو پکڑنے کی کوشش کی تو وہ پھنکار مار کر سانپ بن گئی اور درختوں کی طرف بھاگ گئی۔ اتنی دیر میں کامران اپنا پراسرار نقاب پہن چکا تھا۔ نقاب پہنتے ہی وہ انتہائی طاقتور پراسرار نقاب پوش بن گیا۔ اس کے جسم پر جیکٹ ، پتلون اور سر پر ہیٹ نمودار ہو گیا۔ کمر کے ساتھ دو ریوالور بھی ظاہر ہو گئے ۔ دُوسری طرف ڈاکو، ناگن جدھر گئی تھی اُدھر فائر کر رہے تھے ۔ کامران نے ایک ہی جھٹکے سے رسّی کو توڑ دیا اور آگ کے شعلوں میں سے نکل کر ڈاکوؤں کے سامنے آیا تو وہ دنگ رہ گئے کہ نقاب پوش کہاں سے آگیا!

کامران نے اپنا خاص نعرہ لگایا۔ "ملک دشمنوں کے لئے موت!" اور پھر دونوں ریوالور تان کر بلند آواز میں کہا "ہتھیار پھینک دو اور اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔"

ڈاکوؤں کے سردار نے قہقہہ لگایا اور رائفل کی نالی کامران کے سینے کی طرف کرتے ہوئے نفرت سے بولا۔ "تو بھی پولیس کا جاسوس لگتا ہے ۔ مرنے کے لئے تیار ہو جا!"

اس کے ساتھ ہی اُس نے فائر کر دیا زور کا دھماکہ ہوا۔ گولی رائفل سے نکل کر سیدھی کامران کے سینے پر لگی اور لگتے ہی نیچے گر

پڑی۔ کامران کے سینے پر ہلکی سی خراش تک نہ آئی۔ سردار سمجھا کہ اسکا نشانہ ٹھیک نہیں لگا۔ اس نے فوراً دوسرا اور پھر تیسرا فائر کر دیا۔ یہ گولیاں بھی کامران کے سینے سے لگ کر نیچے گر پڑیں۔ سردار نے چیخ کر کہا۔ "اسے بھون کر رکھ دو۔"

سارے ڈاکوؤں کی رائفلیں کامران پر دھڑا دھڑا فائر کرنے لگیں۔ لیکن کامران اپنی جگہ پر اطمینان سے کھڑا رہا۔ گولیاں اس کے جسم سے ٹکرا ٹکرا کر نیچے گر رہی تھیں۔ تب اُس نے دونوں ریوالور اُوپر اٹھائے اور سردار کے دائیں بائیں کھڑے ڈاکوؤں پر فائر کئے۔ دونوں ڈاکو چیخ مار کر گر گئے۔ پھر تیسرا، چوتھا اور پانچواں فائر کیا اُس کی گولیاں ڈاکوؤں کے جسموں کو پھاڑتی ہوئی نکل رہی تھیں۔ ڈاکوؤں میں بھگدڑ مچ گئی۔ دوسری طرف ناگن راگنی نے بھی سانپ بن کر ڈاکوؤں کو ڈسنا شروع کر دیا۔ کامران ڈاکوؤں میں گھس گیا اور ڈزن ڈزن فائرنگ کرنے لگا۔ ڈاکو ایک ایک کر کے گرتے گئے کوئی درخت کے پاس گرا اور کوئی گولی کھا کر اُچھلا اور خون میں لت پت ہو گیا۔ یہ حالت دیکھ کر ڈاکوؤں کے سردار نے خنجر نکالا اور بھاگ کر کامران کے سینے پر وار کیا۔ مگر خنجر بھی کامران کے سینے سے ٹکرا کر ٹیڑھا ہو گیا اور سردار لڑکھڑا گیا۔ کامران نے ریوالور کی نالی ڈاکوؤں کے سردار کی کھوپڑی کے ساتھ لگا دی اور کہا:

"اگر اپنی جگہ سے ہلے تو کھوپڑی اُڑا دوں گا۔"

پھر اس نے ناگن کو آواز دی۔ ناگن راگنی سُنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والی لڑکی کی شکل میں کامران کے پاس آ گئی۔ کامران نے پوچھا۔ "باقی ڈاکوؤں کا کیا بنا؟"

ناگن راگنی نے کہا "سب کے سب مر گئے۔"

سردار پھٹی پھٹی آنکھوں سے کبھی نقاب پوش کامران اور کبھی ناگن راگنی کو تک رہا تھا۔ کامران نے اس سے پوچھا مقدّس دیوی کا قیمتی ہار جو اس نے سپیرے سے چھینا تھا، کہاں ہے۔ سردار نقاب پوش کی طاقت سے واقف ہو چکا تھا۔ کہنے لگا "میری جیب میں ہے"۔

اس نے جیب سے خوبصورت قیمتی ہیروں کا ہار نکال کر کامران کو دے دیا۔ کامران نے ناگن راگنی کو ہار دکھاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا یہی وہ ہار ہے؟" "ہاں" ناگن راگنی نے جواب دیا۔

کامران نے ہار اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اُس کے ریوالور کی نالی ڈاکوؤں کے سردار کی کھوپڑی سے لگی ہوئی تھی۔

ڈاکوؤں کا سردار بولا "مجھے معاف کر دو۔"

کامران نے غصّے سے کہا "تم نے نہ جانے کتنی ماؤں کے بیٹوں کا خون بہایا ہے، کتنے بچّوں کو یتیم کیا ہے۔ تمھیں کیسے معاف کر دوں؟ میں وطنِ عزیز کو تُم ایسے جرائم پیشہ ڈاکوؤں سے پاک کرنے کے لئے ہی یہاں آیا ہوں۔"

یہ کہہ کر اُس نے فائر کر دیا۔ دھماکے کے ساتھ ریوالور کی گولی نے ڈاکوؤں کے سردار کی کھوپڑی اُڑا دی۔ وہ ایک طرف بے جان ہو کر گر پڑا۔

کامران نے ریوالور کی نالکی کو پھونک مار کر پیٹی کے ساتھ لگایا اور ناگن راگنی سے بولا! "چلو، ناگن راگنی یہ ہار جس کی امانت ہے اس تک پہنچا آئیں۔"

جنگل میں ہر طرف ڈاکوؤں کی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ یہ وہ ڈاکو تھے جنہوں نے نہ جانے کتنے گھروں کو لوٹا تھا۔ کتنے بے قصور انسانوں، بوڑھوں، بچوں اور عورتوں کو قتل کیا تھا۔ انہیں اپنے گھناؤنے جرائم کی سزا مل گئی تھی۔

کامران نے ناگن راگنی کو ساتھ لیا اور رات کے اندھیرے میں ڈاکوؤں کے ڈیرے سے نکل کر اس گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا جہاں انہیں موئن جودڑو کے کھنڈر کے تہ خانے میں ہیروں کا ہار دیوی کو واپس کرنا تھا۔

آدم خور

مارگرٹ وِھن

سلیم احمد صدیقی

اِنگلستان کے لوگ سمجھتے ہیں ، جو انگریز ہندوستان میں کچھ عرصہ رہا ہو، اُس نے شیر کا شکار ضرور کیا ہوگا ۔ حالانکہ اِس بات میں بالکل سچّائی نہیں ۔ اور اِس بات کی سب سے بڑی گواہ میں خود ہوں ۔ میں ہندوستان میں ایک سال تک رہی لیکن چڑیا گھر کے شیر کے سوا کسی شیر کی شکل تک نہیں دیکھی ۔

ہاں البتّہ انگلستان آنے سے کچھ دن پہلے ایک شیر سے میرا سامنا ضرور ہوا ۔ مگر اُس وقت اُسے مارنے کے لیے میرے پاس کوئی بھی ہتھیار نہ تھا ۔ میں اُس دن ایک تیرہ سالہ ہندوستانی لڑکی، لالی، کے ہمراہ شکروی گاؤں سے ایک میل دور مچھلی کا شکار کھیلنے گئی تھی ۔ میرے پاس مچھلیاں پکڑنے کی بنسی اور چائے کا تھرموس تھا، اور لالی کے ہاتھ میں صرف ناشتے دان ۔

ہم نے سُنا تھا کہ اُن دنوں دریا میں مہاشیر نسل کی مچھلیاں آئی ہوئی ہیں ۔ بس ہم نے دریا کے کنارے، ایک اچھّی سی جگہ دیکھ کر، بنسی پانی میں ڈال دی اور کسی موٹی تازی مچھلی کے پھنسنے کا اِنتظار کرنے لگے ۔ میرا خیال تھا کہ ہم دوپہر تک دو ایک مچھلیاں ضرور پکڑ لیں گے، مگر دو گھنٹے بیٹھے رہنے کے باوجود مچھلی تو کیا، کچھوا تک کانٹے میں نہ پھنسا ۔ آخر جھنجھلا کر میں نے بنسی پانی سے نکالی اور کانٹے میں دوبارہ چارہ لگا کر اُسے دریا میں ڈال دیا ۔ تب اچانک مجھے لالی کی آواز سُنائی دی "میم صاحب! میم صاحب!"

میں نے جھٹ پیچھے مُڑ کر دیکھا ۔ لالی ایک پتّھر پر بیٹھی بائیں جانب اِشارہ کر رہی تھی "میم صاحب! ۔۔۔ میم صاحب! ۔۔۔ شیر"! اُس نے خوف زدہ آواز میں کہا ۔

میں لالی کی طرف جانا چاہتی تھی کہ اُسی لمحے کانٹے میں مچھلی پھنس گئی، جو شاید بہت بڑی تھی، کیوں کہ اُس نے بنسی اتنے زور سے کھینچی کہ میں زمین پر گر پڑی اور پھر گھسٹتی ہوئی ایک پتّھر سے ٹکرا گئی ۔ چند سکنڈ کے لیے میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا ۔

لالی دوڑ کر میرے پاس آئی اور مجھے اُٹھانے کی کوشش کرنے لگی ۔ "میم صاحب! زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟ آپ ٹھیک تو ہیں؟ وہ ۔۔۔ اُدھر، جھاڑیوں میں، ایک شیر بیٹھا ہے" اس نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا ۔

"میرے پاؤں میں موچ آگئی ہے" میں نے اُسے بتایا "میں ہِل نہیں سکتی ۔ مگر تُم ڈرو نہیں ۔ اگر ہم چُپ چاپ بیٹھے رہے تو شیر ہمیں کچھ نہیں کہے گا" ۔ میں نے کہیں پڑھا تھا کہ شیر اُس وقت تک آدمی پر حملہ نہیں کرتا جب تک اُس پر حملہ نہ کیا جائے ۔ بہرحال، شیر کو اِتنے قریب دیکھ کر میرے حواس بھی جواب دینے لگے تھے ۔

لالی گہرے گہرے سانس لے رہی تھی، اور اُس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد ہو گیا تھا ۔ اِتنے میں شیر جھاڑی میں سے نکل کر باہر آگیا تھا اور ہماری طرف دیکھ رہا تھا ۔ اُسے آگے بڑھتا دیکھ کر لالی نے دبی دبی چیخ ماری اور بولی "آپ نے دیکھا، میم صاحب؟ شیر لنگڑا رہا ہے ۔ یہ

تو وہی تان والا آدم خور ہے ۔ چھ مہینے بعد پھر واپس آگیا ہے ۔ اِسے میرے ماں باپ کو کھا کر بھی چین نہ آیا ۔ اب یہ پھر آگیا ہے"!

میں نے سہمی ہوئی لالی کا بازو پکڑ کر اُسے اپنے ساتھ چمٹالیا اور تسلّی دیتے ہوئے کہا"گھبراؤ نہیں ۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ۔ خدا نے چاہا تو ہمیں کچھ نہیں ہوگا"۔

مگر دل ہی دل میں میں خود ڈر رہی تھی ۔ یہ شیر واقعی تان والا کا آدم خور تھا اور اس نے چھ سات مہینے پہلے لالی کے گاؤں میں آکر اُس کے ماں باپ کو کھالیا تھا ۔ تب سے لالی میرے ساتھ رہنے لگی تھی ۔

"میم صاحب"! لالی نے آہستہ سے کہا "یہ ہم میں سے ایک کو ضرور کھا جائے گا ۔ ذرا دیکھیے تو سہی ۔ اِس کا پیٹ کتنا پتلا نظر آرہا ہے ۔ لگتا ہے کئی دن کا بُھوکا ہے"۔

لالی کے اِس فقرے نے میرے جسم میں سنسنی دوڑادی ۔ اگر شیر نے واقعی ہم میں سے کسی ایک کو ضرور کھانا ہے ، تو ظاہر ہے کہ وہ مجھی کو کھائے گا ۔ لالی دوڑ سکتی تھی، اور میں موچ کی وجہ سے ایک قدم بھی نہیں چل سکتی تھی ۔

شیر اب ایک قدم اور آگے آگیا تھا ۔ شاید وہ یہ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ ہم ڈر کر بھاگ کیوں نہیں رہے!

"لالی" میں نے کہا "چُپ چاپ بیٹھی رہو ۔ کچھ دیر بعد خود ہی چلا جائے گا"۔

میرا فقرہ مشکل سے پُورا ہوا ہوگا کہ شیر چند قدم اور آگے آگیا ۔ یُوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے چھلانگ لگا کر ہم میں سے کسی کو دبوچ لے گا ۔

میں نے اُٹھنے کی کوشش کی تو اُٹھا نہ گیا ۔ پیر میں سخت تکلیف ہو رہی تھی ۔ اب کیا کروں؟ میری جیب میں صرف ایک چھوٹا سا چاقو تھا اور ظاہر ہے اُس سے شیر کو نہیں مارا جاسکتا تھا ۔

میں اِسی شش و پنج میں تھی کہ لالی نے میرا بازو دبایا اور آہستہ سے کہا "میم صاحب! میں گاؤں کی طرف جارہی ہوں"۔

میں نے ڈانٹ کر کہا "پاگل نہ بنو ۔ تمہارے دوڑتے ہی وہ چھلانگ لگا کر تمہیں دبوچ لے گا ۔ آہستہ آہستہ میرے پیچھے آجاؤ اور پھر چُپکے سے دریا میں کُود جاؤ ۔ اِس کے بعد تیر کر دوسرے کنارے پر چلی جانا اور گاؤں والوں کو بُلا لانا"۔

"نہیں، میم صاحب"! لالی بولی "میں بھاگ رہی ہوں ۔ میری جیسی لڑکیاں تو بے شمار ہیں، مگر آپ جیسی مہربان میم صاحب کوئی کوئی ہوتی ہے"۔

یہ کہ کر وہ گاؤں کی طرف چل دی اور میں اُسے پکارتی ہی رہ گئی "لالی! ۔۔ لالی! ۔۔ رُک جاؤ! لالی"!

اُسی وقت شیر ایک ہیبت ناک چیخ مار کر لالی کی طرف اُچھلا ۔ میں نے خوف کے مارے آنکھیں بند کر لیں اور خدا سے دُعا کرنے لگی کہ لالی کو بچالے ۔

چند لمحوں بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو شیر سڑک پر کھڑا تھا اور لالی سڑک کے اِرد گرد اُگی ہُوئی گھنی جھاڑیوں میں چُھپ گئی تھی ۔ میں پھر خدا سے دُعا مانگنے لگی، کیونکہ لالی ابھی خطرے سے باہر نہیں تھی ۔

شیر جھاڑیوں کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک زور دار چیخ کی آواز آئی اور لالی لُڑھکتی ہوئی سڑک پر آگری ۔

اِس کے ساتھ ہی جنگلی سُؤر کا ایک بچّہ سڑک پر آگیا ۔ میں سمجھ گئی کہ کیا ہوا ۔ جنگلی سُؤر کا یہ بچّہ جھاڑی میں سویا پڑا تھا کہ لالی کا پاؤں اُس پر پڑگیا، جس کی وجہ سے وہ لُڑھک کر سڑک پر آگئی اور سُؤر کا بچّہ بھی ڈر کر اُس کے پیچھے پیچھے بھاگ کھڑا ہوا ۔

خوشی کی بات یہ تھی کہ لالی لُڑھکنیاں کھاتی ہوئی سڑک کے دوسرے کنارے پر چلی گئی تھی لیکن سُؤر کا بچّہ گھبراہٹ میں شیر کے پاس آگیا تھا ۔ اب شیر اپنا پنجہ اُس کی طرف بڑھا رہا تھا اور وہ دہشت ناک آواز میں چلّا رہا تھا ۔ اچانک جھاڑیوں میں سے سُؤر کے کئی بچّے نکل آئے ۔ اُن کے پیچھے اُن کی ماں بھی تھی ۔ سُؤرنی نے شیر کو دیکھ کر بڑی خوف ناک آواز نکالی ۔ شاید وہ سُؤر کو مدد کے لیے بُلا رہی تھی ۔

سُؤر اپنی مادہ کی آواز سُنتے ہی دوڑا ہوا آیا اور شیر کے پنجے کے نیچے اپنے بچّے کو دبا ہوا دیکھ کر پُوری طاقت سے اُس پر جھپٹا ۔ شیر بھی شاید بُھوک سے باؤلا ہو رہا تھا ۔ اُس نے بچّے پر سے پنجہ اُٹھا کر سُؤر کے مارا، اور اگر سُؤر ایک طرف کو نہ ہو جاتا تو شیر کے ناخن اُس کی کھال اُدھیڑ دیتے ۔

اب سُؤر بھی غُصّے سے پاگل ہوگیا ۔ اُس نے دو قدم پیچھے ہٹ کر سر نیچے کیا اور پھر چھلانگ لگا کر اپنے لمبے نوکیلے دانت شیر کے پیٹ میں گھونپ دیے ۔ اگر شیر کا پیٹ بھرا ہوا ہوتا تو وہ اِس طرح کٹ جاتا جس طرح چاقو سے خربُوزہ ۔ مگر خالی ہونے کی وجہ سے

اُس کی کھال لٹکی ہوئی تھی ۔ سُؤر کے دانت اُس لٹکی ہوئی کھال میں لگے جس سے وہ زخمی ہوگئی ۔ شیر پھر سُؤر پر جھپٹا اور سُؤر نے ایک مرتبہ پھر اُس کے پیٹ میں دانت گھونپنے کی کوشش کی ۔

اب سُؤر کو اِحساس ہوا کہ جس بچّے کو بچانے کے لیے وہ شیر سے لڑ رہا ہے، وہ تو جھاڑیوں میں جا کر چُھپ گیا ہے ۔ اُس نے ایک قدم پیچھے ہٹایا اور زور زور سے آوازیں نکالیں تاکہ شیر ڈر کر بھاگ جائے ۔

لالی جہاں لُڑھکنیاں کھا کے گری تھی، وہیں پڑی ہوئی یہ خوفناک منظر دیکھ رہی تھی ۔ اب وہ اُٹھ کر بھاگنا چاہتی تھی کہ سُؤر نے اُسے دیکھ لیا ۔ وہ سمجھا کہ شیر کی طرح یہ بھی میری دُشمن ہے ۔ وہ لالی کی طرف جھپٹنے ہی کو تھا کہ شیر نے اُس پر حملہ کر دیا ۔ میں نے جلدی سے آنکھیں بند کر لیں، اور جب کھولیں تو دیکھا کہ شیر سُؤر کے اُوپر ہے اور سُؤر اُس کے نیچے دبا ہوا ہے ۔

اب چند ہی منٹ میں سُؤر کا خاتمہ ہونے والا تھا ۔ اور اِس کے بعد شیر لالی کی خبر لیتا ۔ میں نے زور سے کہا "لالی! بھاگ جاؤ"!

لالی کھڑی ہوگئی تھی اور اُس کی آنکھیں عجیب سے انداز میں چمک رہی تھیں ۔ میں پھر چِلّائی "دوڑو لالی! خدا کے واسطے بھاگ جاؤ"۔

سُؤر اور شیر کی لڑائی کی وجہ سے سڑک پر دُھول اُڑنے لگی تھی جس نے شیر اور سُؤر دونوں کو ڈھانپ لیا تھا ۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ۔ کسی بھی لمحے سُؤر مر سکتا تھا، اور اُس کے بعد لالی کی باری آنی تھی ۔ میں نے لالی سے کہا "بھاگتی کیوں نہیں؟ بھاگو"! لالی نے اِس طرح میری طرف دیکھا جیسے پہلی بار میری آواز سُنی ہو ۔ وہ ایک دم دوڑ پڑی ۔

لیکن وہ گاؤں کی طرف دوڑنے کے بجائے میری یعنی دریا کی طرف دوڑ رہی تھی ۔

"دوسری طرف جاؤ ۔ گاؤں کی طرف" میں نے زور سے کہا ۔ لیکن لالی پر میری آواز کا کوئی اثر نہ ہُوا ۔ وہ دوڑتی ہُوئی دریا کے کنارے آئی اور ایک بڑا سا پتّھر اُٹھانے لگی ۔ میری سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کرنے والی ہے ۔ میں نہ کچھ کہہ سکتی تھی، نہ کر سکتی تھی ۔ صرف بے بسی کے عالم میں اس ڈرامے کو دیکھ رہی تھی، جو بڑا ہی سنسنی خیز تھا ۔

لالی نے پتّھر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر سر سے اُوپر اُٹھا لیا تھا اور میرے سامنے سے ہوتی ہوئی اُدھر جا رہی تھی جدھر سُؤر اور شیر لڑ رہے تھے ۔ اب سُؤر تھک چکا تھا اور گرد و غُبار کا بادل بھی خاصا چھٹ گیا تھا ۔ وہ پتّھر اُٹھائے اُٹھائے شیر اور سؤر کے بالکل قریب پہنچ چکی تھی اور اُس وقت خود ایک خوں خوار شیرنی نظر آ رہی تھی ۔ اور پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے اُس نے پُوری قُوّت سے پتّھر شیر کے سر پر دے مارا ۔ شیر کی دہاڑ سے میرا کلیجا دہل گیا ۔

شیر دہاڑنے کے بعد کچھ دیر تڑپا اور پھر ٹھنڈا ہو گیا ۔ سُؤر بڑی مشکل سے شیر کے پنجے سے نکلا اور لنگڑاتا ہوا جھاڑیوں میں چلا گیا ۔

لالی ہاتھ جھاڑتی ہُوئی میری طرف بڑھی ۔ اب اُس کے چہرے پر غُصّے کے بجائے معصُومیّت جھلک رہی تھی ۔ وہی معصُومیّت اور بھول پن جو ایک تیرہ سال کی لڑکی کے چہرے پر ہوتا ہے ۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی میرے پاس آئی اور دھیرے سے بولی "تان والا آدم خور نے میرے ماں باپ کو کھا لیا تھا ۔ میں نے اُسے مار ڈالا ہے ۔ اب میرا کلیجا ٹھنڈا ہو گیا ہے"۔

اور میں حیرت سے ، مُنہ پھاڑے ، اُس معصوم لڑکی کو دیکھ رہی تھی جسے بہادُری کا بڑے سے بڑا اِنعام بھی دیا جاتا تو بے جا نہ ہوتا ۔

مارگرٹ روتھن نے یہ کہانی آج سے 45 سال پہلے لکھی تھی ۔ اُس وقت ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت تھی اور مارگرٹ کا شوہر محکمہ جنگلات میں افسر تھا ۔

شیشہ

امجد علی

ہماری زمین پر بعض مادّے قُدرتی طور پر پائے جاتے ہیں ۔ مثلاً لکڑی، پتّھر وغیرہ ۔ لیکن بعض مادّے انسان مختلف چیزوں کو مِلا کر خود تیار کرتا ہے تاکہ وہ اپنی ضروریات کو پُورا کر سکے ۔ اِنسان کے بنائے ہوئے سب سے پُرانے مادّوں میں شیشہ سرِفہرست ہے ۔ شیشہ آج سے 3,000 سال پہلے بنایا گیا تھا ۔ اس کی تیّاری میں ریت، چُونے کا پتّھر اور سوڈے کا آمیزہ اِستعمال ہوتا ہے ۔ ان مرکّبات کو پیس کر 1,500 درجہ سنٹی گریڈ پر گرم کیا جاتا ہے ۔ اس طرح ایک شفاف مادّہ حاصل ہوتا ہے جو ٹھنڈا ہو کر شیشے کی شکل اِختیار کر لیتا ہے ۔ رنگین شیشہ تیار کرنے کے لیے اس آمیزے میں بعض دوسرے کیمیائی مرکّبات مِلا دیے جاتے ہیں ۔ سبز مائل شیشہ تیار کرنے کے لیے آمیزے میں اِستعمال ہونے والی ریت سے لوہا الگ نہیں کیا جاتا ۔ یہ لوہا قُدرتی طور پر ریت میں موجود ہوتا ہے ۔

شیشے سے کھانے پینے کے برتن، صُراحیاں اور مرتبان وغیرہ بنائے جاتے ہیں ۔ پہلے پہل پگھلے ہوئے گرم شیشے کو دھات کی نلکی میں لے کر سانس کے ذریعے مختلف چیزیں بنائی جاتی تھیں ۔ جس طرح آپ صابن کے بلبلے بناتے ہیں ۔ لیکن موجودہ زمانے میں بوتلیں، جار اور شیشے کی دوسری چیزیں سانچوں کے ذریعے مشینوں سے تیار کی جاتی ہیں۔ شیشے کی چادریں (Sheets) حاصل کرنے کے لیے پگھلے ہوئے شیشے کو پگھلی ہوئی دھات پر اُنڈیل دیا جاتا ہے ۔ یہ چادریں عمارتوں کی کھڑکیوں اور دروازوں میں لگائی جاتی ہیں ۔

مختلف کیمیائی مرکّبات کے اِستعمال سے ہم کئی قسم کا شیشہ تیار کرتے ہیں جو مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا ہے ۔ موٹر گاڑیوں میں ڈرائیور کے سامنے وِنڈ سکرین میں لگا ہوا شیشہ بہت مضبُوط ہوتا ہے ۔ یہ اگر ٹُوٹ بھی جائے تو اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جاتے ہیں جن کی دھار دار نوکیں نہیں ہوتیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ان سے ڈرائیور زخمی نہیں ہوتا ۔ عام قسم کا شیشہ گرم کرنے سے ٹوٹ جاتا ہے لیکن پائریکس (Pyrex) قسم کا شیشہ بہت زیادہ درجۂ حرارت برداشت کر سکتا ہے ۔ اس لیے یہ شیشہ نہ تو گرم کرنے سے ٹوٹتا ہے اور نہ گرنے سے ۔ شیشے کی اِس قسم کو کھانا پکانے والے برتنوں کی تیاری میں استعمال کیا جاتا ہے ۔ خلائی گاڑیوں اور راکٹوں کو خلا میں اِنتہائی درجۂ حرارت کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ اِس لیے اِن پر شیشے کی ایک خاص قسم پائروسل (Pyrosil) کی تہہ چڑھا دی جاتی ہے ۔ یہ شیشہ بھی اب باورچی خانے میں استعمال ہونے لگا ہے ۔

شیشے سے بہت عُمدہ دھاگے بنائے جاتے ہیں جنہیں فائبر گلاس (Fibreglass) کہا جاتا ہے ۔ ان کو پلاسٹک کے ساتھ ملا کر بہت مضبُوط مادّہ بنایا جاتا ہے ۔ یہ مادّہ زنگ لگنے اور گلنے سڑنے سے محفوظ رہتا ہے ۔ اس مادّے کو کشتیوں اور جہازوں کے بیرُونی حِصّوں میں اِستعمال کیا جاتا ہے ۔

آج کل کئی چیزیں شیشے کے نعم البدل کے طور پر سامنے آئی ہیں ۔ اِن میں پلاسٹک سرِفہرست ہے ۔ شیشے سے تیار ہونے والی ہر چیز پلاسٹک سے بھی بنتی ہے ۔ لیکن پلاسٹک کی اشیا زیادہ درجۂ حرارت برداشت نہیں کر سکتیں ۔ نیز شیشے کے برعکس پلاسٹک پر کیمیائی مرکّبات کا اثر ہوتا ہے ۔ لہٰذا پلاسٹک سے شیشہ بہتر ہے ۔

جوابات علمی آزمائش مئی 1989ء

1۔ جنگِ فجار قریش اور بنی قیس کے مابین ہوئی تھی۔
اس وقت حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر 15 سال تھی ۔
2۔ میثاق مدینہ ۔
3۔ تین سال تک شعب ابی طالب میں رہے۔
4۔ بیعت رضوان
5۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کی افواہ پر
6۔ حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہو کر شہید ہوئے
7۔ لاتثریب علیکم الیوم الخ
8۔ ابوسُفیان کی بیوی ہند یا ہندہ نے حضرت حمزہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کلیجہ چبایا تھا۔
9۔ چچا، بھتیجے اور رضاعی بھائی کا۔
10۔ حبشی غلام (وحشی) نے زہریلے تیر سے ۔
11۔ حجاج بن یوسف نے قرآن حکیم پر اعراب لگوائے تھے۔
12۔ عبداللہ بن زُبیرؓ رضی اللہ عنہ نو برس تک خلیفہ رہے ۔
13۔ میدان بدر میں 17 ، رمضان المبارک سنہ 2ھ
14۔ سفاح کے معنی خون بہانے والا۔ اصل نام ابوالعباس بن محمد تھا
15۔ سفاح خاندان بنوعباسیہ کا بانی تھا۔

ہوا چلی

مولانا اسماعیل میرٹھی

ہونے کو آئی صُبحْ تو ٹھنڈی ہوا چلی
کیا دھیمی چال سے یہ خُوش ادا چلی
لہرا دیا ہے کھیت کو ، ہِلتی ہیں بالیاں
پودے بھی جُھومتے ہیں ، لچکتی ہیں ڈالیاں
پُھلواریوں میں تازہ شِگُوفے کِھلا چلی
سویا ہُوا تھا سبزہ ، اُسے تُو جگا چلی
سر سبز ہوں درخت نہ باغوں میں تُجھ بغیر
تیرے ہی دَم قدم سے ہے بھاتی چمن کی سیر
پڑ جائے اِس جہاں میں ہوا کی اگر کمی
چوپایہ کوئی زندہ بچے اور نہ آدمی
چِڑیوں کو یہ اُڑان کی طاقت کہاں رہے
پھر کائیں کائیں ہو نہ غُٹرغُوں نہ چہچہے
بندوں کو چاہئیے کہ کریں بندگی ادا
اُس کی کہ جِس کے حُکم سے چلتی ہے یہ سدا

عظمت

سیّد توقیر حُسین شاہ

طارق نے ایک آنکھ بند کر کے پُوری یک سُوئی کے ساتھ شربتی بنٹے کو دیکھا اور تاک کر نشانہ لگایا۔ "وہ مارا! زندہ باد"! طارق زور سے چلّایا اور بھاگ کر تمام گولیاں جمع کرنے لگا۔ نوید نے مایُوسی سے دیکھا۔ اُس کے پاس تمام گولیاں ختم ہو چکی تھیں۔ شبّیر پہلے ہی تمام گولیاں طارق سے ہار چکا تھا۔ اب سب نے زمین سے اپنے بستے جھاڑ کر اُٹھائے اور گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

طارق، نوید اور شبّیر علی پور میں رہتے تھے جو درمیانہ طبقے کے لوگوں کا ایک قصبہ تھا۔ یہاں لڑکوں کا ایک ہائی سکول تھا جس میں طارق، نوید اور شبّیر ایک ساتھ پڑھتے تھے۔ یہ تینوں دسویں جماعت کے طالبِ علم تھے۔ ماں باپ اُنہیں پڑھنے کے لیے سکول بھیجتے مگر وہ آدھی چُھٹّی کے وقت سکول سے بھاگ نکلتے۔ سکول سے کچھ دور ایک خالی جگہ تھی۔ یہاں پر وہ کبھی گولیاں کھیلتے اور کبھی گلّی ڈنڈا۔ اگر ہوا چل رہی ہوتی تو پتنگ بازی بھی ہو جاتی۔ کئی دفعہ اُن کو آدھی چُھٹّی میں بھاگ جانے پر سزا بھی ملی۔ مگر اِس کا اُن پر کوئی اثر نہ ہوا۔ کئی اُستادوں نے تو اُن پر توجّہ دینا ہی چھوڑ دی تھی۔ دوپہر کو کھانے کے بعد جب تمام لوگ گھروں میں آرام کرتے تو یہ لوگ گولیاں کھیلتے اور پتنگ بازی کرتے۔

ایک دن صبح سکول کے دروازے پر طارق نے نوید سے کہا "آج تو بڑی اچھی ہوا چل رہی ہے۔ پتنگ اُڑانے کا خوب مزا آئے گا"۔ نوید نے فوراً ہاں میں ہاں ملا دی۔ اچانک سکول کی گھنٹی بجنے لگی اور تمام بچّے اسمبلی کی طرف چل پڑے۔ اسمبلی کے بعد طارق، نوید اور شبّیر اپنی کلاس میں چلے گئے۔

ماسٹر صاحب جیسے ہی کلاس میں داخل ہوئے، تمام لڑکے ادب سے کھڑے ہو گئے۔ "بیٹھ جاؤ، بچّو!" ماسٹر صاحب بولے۔ اُن کے ساتھ ایک صحّت مند لڑکا بھی تھا "بچّو! آج سے آپ کا ایک ساتھی بھی آپ کے ساتھ پڑھے گا"۔ ماسٹر صاحب نے بتایا۔ "اِن کا نام عظمت حُسین ہے۔ پہلے یہ لاہور میں رہتے تھے۔ اب علی پور آ گئے ہیں"، ماسٹر صاحب نے عظمت کا تعارُف کرواتے ہوئے کہا۔ عظمت نے خود اِعتمادی سے مسکراتے ہوئے سب لڑکوں کو سلام کیا اور نوید کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ماسٹر صاحب نے کئی سوال پوچھے۔ اکثر کے جوابات عظمت نے دیے۔ نوید، طارق اور شبّیر کو جواب نہ دینے کی وجہ سے ڈانٹ پڑی۔

"عظمت میاں، آپ نے یہ سبق پہلے پڑھا تھا؟" ماسٹر صاحب نے پوچھا۔

عظمت نے ادب سے کھڑے ہو کر کہا "جی ہاں' جناب۔ میں نے یہ سبق گھر پر پڑھا تھا۔ ماسٹر صاحب نے عظمت کو شاباش دی۔ اُسی وقت پیریڈ ختم ہونے کی گھنٹی بج گئی۔

آدھی چُھٹّی کے وقت عظمت نوید کے پاس آیا اور اُس سے پوچھا "آپ مسجد کے سامنے والے گھر میں رہتے ہیں"؟

"جی ہاں، مگر آپ کیسے جانتے ہیں؟" نوید حیرت سے بولا۔

"میں نے کل آپ کو اُس گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا"، عظمت نے جواب دیا۔

"ہم لوگ پرسوں ہی آپ کے پڑوس والے گھر میں آئے ہیں" عظمت نے بتایا۔

"آم والے گھر میں"؟ نوید نے پوچھا۔

"جی، اُسی گھر میں"، عظمت نے جواب دیا۔

"آپ کا نام پوچھ سکتا ہوں"؟ عظمت بولا۔

"مجھے نوید حسن کہتے ہیں" نوید نے عظمت کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا

"میرا نام عظمت ہے" عظمت نے بتایا۔ ایک دوسرے سے

مُتعارف ہونے کے بعد نوید اور عظمت آپس میں باتیں کرنے لگے ۔ نوید عظمت کی لیاقت اور اچھی باتوں سے بہت مُتأثر ہوا ۔

اچانک طارق نے نوید کو پُکارا ۔ نوید نے مُڑ کر دیکھا اور عظمت سے کہا "میں ابھی آیا"۔

"میں پتنگیں خرید لایا ہوں ۔ جلدی سے بستہ اُٹھاؤ اور بھاگ چلیں ۔ ماسٹر برکت صاحب آنے والے ہیں" طارق نے نوید کو بستے میں رکھی ہوئی پتنگیں دکھاتے ہوئے کہا ۔ نوید نے مُڑ کر عظمت کو دیکھا ۔ وہ اُسی کی طرف دیکھ رہا تھا ۔ نوید کا پتنگ اُڑانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا ۔ اُس نے طارق سے کہا "آج میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں گا"۔ طارق حیرت سے نوید کو دیکھنے لگا ۔

اُسی وقت گھنٹی بجی اور طارق تیزی سے کلاس سے باہر نکل گیا ۔ نوید کلاس میں واپس چلا گیا ۔ آج اُس کا بھی دل چاہا کہ وہ بھی عظمت کی طرح ماسٹر صاحب کے سوالوں کا جواب دے اور شاباش حاصل کرے ۔ اُس نے دل میں عہد کیا کہ وہ بھی آج سے پڑھائی میں دل لگائے گا ۔ وہ پُورے وقت پر سکول سے نکلا اور عظمت کے ساتھ گھر واپس آیا ۔

شام کو نوید گھر سے نکلا تو گلی میں کھڑے طارق نے لپک کر اُسے آ لیا اور بولا "آج تم کہاں رہے؟ آج تو پتنگیں اُڑانے کا بڑا مزہ آیا ۔ ہم نے تمہاری بڑی کمی محسوس کی ۔ کئی دفعہ سوچا کہ تُمھیں گھر سے بُلوا لوں ۔ مگر تمہاری امی کے غصّے سے ڈر گیا ۔ اچھا ، چلو ۔ اب گولیاں کھیلتے ہیں"۔

نوید نے رنگ برنگی گولیاں دیکھیں تو اُس کا بھی دل کھیلنے کو چاہا اور کچھ دیر بعد وہ سب گولیاں کھیلنے لگے ۔ نوید کھیل میں اتنا مشغول ہُوا کہ اُسے پتا بھی نہ چلا کہ کب عظمت آیا اور کب سے اُسے کھیلتے ہوئے دیکھ رہا ہے ۔ اچانک نوید کی نظر عظمت پر پڑی تو وہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا ۔ وہ بڑی شرمندگی محسوس کر رہا تھا ۔ عظمت نے مسکراتے ہوئے سب سے ہاتھ ملایا ۔

"گولیوں سے کھیلا جا رہا ہے"؟ عظمت نے مسکراتے ہوئے پوچھا ۔

"بس یونہی ذرا وقت گزار رہے تھے" نوید شرمندہ ہوتے ہوئے بولا ۔ مٹّی پر کھیلنے کی وجہ سے اُن کے کپڑے گندے ہو گئے تھے ۔ عظمت نے طارق سے اُس کا نام پوچھا تو اُس نے اپنا تعارُف کروانے کے بعد شبیر کا تعارُف بھی کروایا ۔

"دوستو! وقت گزارنے کے لیے آپ یہ فضول کھیل کیوں کھیلتے ہیں؟ ہاکی یا فُٹ بال کیوں نہیں کھیلتے؟" عظمت نے ان سے پوچھا ۔

طارق بولا "ہاکی یا فُٹ بال کہاں کھیلیں"؟

"وہ جو سکول کے سامنے گراؤنڈ ہے ، وہاں" عظمت نے جواب دیا۔

"وہاں تو علی پور کی ہاکی ٹیم کھیلتی ہے ۔ وہ کسی اور کو گھسنے نہیں دیتے" نوید نے بتایا ۔

"مگر میدان تو سب کا ہوتا ہے" عظمت بولا ۔ پھر اُس نے پوچھا کہ علی پور الیون کے سرپرست کون ہیں ۔ لڑکوں نے جواب دیا کہ کمیٹی کے چیئرمین راؤ صاحب ۔

"کل شام آپ سب مسجد کے پاس جمع ہو جائیں" عظمت نے کہا ۔

"کیوں؟ کہیں جانا ہے؟" شبیر نے پوچھا

"ہاں ، ہم سب مل کر کمیٹی کے چیئرمین صاحب کے پاس جائیں گے ۔ مگر پہلے یہ وعدہ کریں کہ آپ آئندہ کبھی یہ فضول کھیل نہیں کھیلیں گے" عظمت بولا ۔ سب لڑکوں نے وعدہ کیا کہ اگر ان کو گراؤنڈ میں ہاکی کھیلنے کی اجازت مل گئی تو وہ گولیاں نہیں کھیلیں گے۔

دوسرے دن شام کو تمام لڑکے مسجد کے پاس جمع ہو گئے اور وہاں سے وہ کمیٹی کے دفتر گئے ۔ وہاں سے پتا چلا کہ چیئرمین صاحب کسی ضروری کام سے لاہور گئے ہوئے ہیں اور ایک ہفتہ بعد آئیں گے۔

اگلا پورا ہفتہ نوید ، طارق اور شبیر باقاعدگی سے سکول جاتے رہے اور تمام کام وقت پر کرتے رہے ۔ اُستاد اور گھر والے اُن میں یہ تبدیلی دیکھ کر بہت خوش ہوئے ۔ اب یہ لڑکے عظمت کی دیکھا دیکھی مسجد میں باجماعت نماز بھی پڑھنے لگے تھے ۔ دوپہر کو کھانا کھانے کے بعد یہ تمام دوست عظمت کے گھر ایک خالی کمرے میں پڑھتے اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ۔

ہفتے بعد وہ دوبارہ مل کر کمیٹی کے دفتر گئے ۔ چئیرمین راؤ صاحب کے چپراسی نے انہیں اِطلاع کر دی اور راؤ صاحب نے لڑکوں کو اندر بلا لیا ۔ "ہاں بچّو، کیا مسئلہ ہے؟" انہوں نے شفقت سے پوچھا ۔

عظمت نے بڑے ادب سے بتایا "جناب، مسئلہ یہ ہے کہ علی پور کے بچّوں اور نوجوانوں کے لیے کوئی پارک یا گراؤنڈ نہیں ہے ۔ صرف کمیٹی کا ایک میدان ہے جو علی پور الیون کے پاس ہے ۔ اس میدان میں وہ کسی دوسرے کو نہیں کھیلنے دیتے ۔ عرصہ دراز سے وہی پُرانے لڑکے ٹیم میں ہیں ۔ کسی نئے لڑکے کو وہ ٹیم میں شامل نہیں کرتے ۔ مجبوراً لڑکے گلیوں میں گولیاں اور گلّی ڈنڈا جیسے فضول کھیل کھیلتے ہیں"۔

عظمت کی بات مکمل ہونے کے بعد راؤ صاحب نے کہا "بیٹا، مجھے حیرت ہے کہ یہ شکایت آپ سے پہلے کسی نے نہیں کی ۔ علی پور الیون کے مینیجر جاوید صاحب ہر ماہ گرانٹ کے سلسلے میں میرے پاس آتے ہیں ۔ اب وہ ملیں گے تو اُن سے بات کروں گا بلکہ ایسا کریں کہ آپ سب کل شام کو گراؤنڈ میں پہنچ جائیں ۔ جاوید صاحب وہیں ہوں گے ۔ آپکی موجودگی میں ساری بات ہو جائے گی" ۔ لڑکوں نے راؤ صاحب کا شکریہ ادا کیا اور واپس آ گئے ۔

دوسرے دن عظمت کے ہمراہ تمام لڑکے گراؤنڈ میں پہنچ گئے ۔ علی پور الیون پریکٹس کر رہی تھی ۔ تمام لڑکے خاموشی سے گراؤنڈ کے کنارے بنچوں پر بیٹھ گئے ۔ کچھ دیر بعد راؤ صاحب بھی تشریف لے آئے ۔ جاوید صاحب نے اُن کا اِستقبال کیا ۔ جب دونوں بیٹھ گئے تو راؤ صاحب نے عظمت ، شبّیر طارق اور نوید کو بھی بُلوا لیا اور ان سے کہا:

"بچّو! ابھی مینیجر صاحب سے بات ہوئی ہے ۔ اِن کا کہنا ہے کہ اگر ہم تمام لڑکوں کو کھیلنے کی اجازت دے دیں تو گراؤنڈ کی گھاس خراب ہو جائے گی ۔ نئے لڑکوں کی شمُولیت کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ ہر ماہ ٹرائلز ہوتے ہیں اور جو لڑکا ان میں کامیاب ہو جاتا ہے اُسے ٹیم میں شامل کر لیا جاتا ہے"۔

"میں نے ایک دفعہ ٹرائل دیا تھا لیکن مجھے ٹیم میں شامل نہیں کیا گیا" شبّیر بولا ۔

"آپ اچھا نہیں کھیلے ہوں گے" جاوید صاحب نے کہا "کل جمعہ ہے ۔ آپ سب ٹرائلز کے لیے آ جائیں ۔ جو اچھا کھیلے گا، ہم اُسے ٹیم میں شامل کر لیں گے" ۔

دُوسرے دِن شام کو قصبے کے بہت سے لوگ گراؤنڈ میں پہنچ گئے ۔ ٹرائلز شروع ہو گئے ۔ شروع میں تو لڑکے بڑے جوش سے کھیلے مگر پھر بہت جلد تھک گئے ۔ عظمت کے سوا کوئی بھی اچھا کھیل پیش نہ کر سکا ۔ ٹرائلز کے اِختتام پر صِرف عظمت کو منتخب کیا گیا ۔

عظمت مینیجر صاحب کی فِطرت کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا ۔ اُس نے مسجد کے پاس پہنچ کر لڑکوں سے کہا "مایوس نہ ہونا ۔ ہمیں مزید پریکٹس کرنا ہوگی"۔

"مگر عظمت بھائی ، ہم پریکٹس کہاں کریں گے؟" ایک لڑکے نے پوچھا ۔

"فِکر نہ کرو ۔ گراؤنڈ کا بندوبست بھی ہو جائے گا" عظمت نے جواب دیا ۔

دُوسرے دِن سکول سے واپسی پر عظمت کی نظر چوک میں لگے ایک نوٹس پر پڑی ۔ نوید ، شبیر اور طارق بھی اس نوٹس کو پڑھنے لگے ۔ اس میں لکھا تھا کہ دو ماہ بعد علی پور کے ایک زمیندار صاحب ضلع کی سطح پر ایک ٹورنامنٹ کروا رہے ہیں ۔ عظمت یہ نوٹس پڑھ کر کچھ سوچنے لگا ۔ پھر بولا "دوستو! اللہ نے ہمیں بہت اچھا موقع دیا ہے ۔ پرسوں سے گرمیوں کی چھٹیاں ہو رہی ہیں ۔ اگر ہم چاہیں تو اس ٹورنامنٹ میں حصہ لے سکتے ہیں"۔

"مگر کس طرح؟" نوید نے پوچھا ۔

"میرے ذہن میں ایک بہت اچھا پلان ہے ۔ کل ہم سب راؤ صاحب کے پاس جائیں گے"، عظمت نے کہا ۔

اگلی شام کو تمام لڑکے راؤ صاحب کے دفتر کے سامنے جمع ہو گئے ۔ راؤ صاحب نے عظمت اور اُس کے تین ساتھیوں نوید، طارق اور شبّیر کو اندر بلا لیا اور کہا "ہاں بھئی، عظمت میاں ۔ کیسے آنا ہوا"؟

"جناب آپ ہمیں سکول کے عقب والی سرکاری زمین دے دیں ۔ گراؤنڈ ہم خود بنا لیں گے"، عظمت نے کہا

"مگر وہ جگہ تو اُونچے نیچے ٹیلوں اور گڑھوں سے بھری پڑی ہے ۔ اس کے علاوہ قصبے کا کچرا بھی وہیں پھینکا جاتا ہے ۔ وہ تو بڑی مشکل سے ہموار ہوگی" راؤ صاحب نے بتایا ۔

"جناب ، آپ ہمیں اجازت دے دیں ۔ باقی کام ہم کر لیں گے" عظمت نے اصرار کیا ۔

"اچھا بھئی، میری طرف سے اجازت ہے"۔ لڑکے راؤ صاحب کے منہ سے اجازت کے الفاظ سن کر بہت خوش ہوئے اور واپس آگئے۔

اگلے دن اسکول کی گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو گئیں۔ تقریباً بیس لڑکے عظمت کے گھر کے قریب جمع تھے۔ عظمت ان لڑکوں سے کہہ رہا تھا "اگر آپ چاہتے ہیں کہ مینیجر جاوید کی مکّاری سب پر آشکار ہو تو ہمیں اپنی مدد آپ کے تحت کام کرنا ہو گا۔ ہم نے راؤ صاحب سے جو زمین حاصل کی ہے، اگرچہ وہ بہت ناہموار ہے مگر کوشش کریں تو چند دنوں میں تیار ہو جائے گی اور ہم کو ایک ماہ ٹورنامنٹ کے لیے پریکٹس کرنے کا بھی مل جائے گا۔ کیا آپ لوگ اس کام کے لیے تیار ہیں؟" سب لڑکوں نے ہاتھ اٹھا کر عظمت کی تائید کی۔

دوسرے دن قصبے کے لوگوں نے دیکھا کہ لڑکے کُدالیں اور پھاوڑے لے کر سکول کے پیچھے والے گراؤنڈ کو صاف کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ عظمت نے تمام لڑکوں کو پانچ پانچ گروپوں میں تقسیم کر دیا تھا اور اُن کے ذمّے مُختلف کام لگا دیئے تھے۔ لوگوں نے سوچا کہ لڑکے کچھ دن بعد خود ہی تھک ہار کر چھوڑ دیں گے۔ مگر وہ دُھن کے پکّے تھے۔ ہفتے بعد تمام گراؤنڈ ہموار ہو گئی۔ اس کے بعد انہوں نے کمیٹی سے رولر منگوا کر تمام گراؤنڈ کو سخت بھی کر دیا۔

دو ہفتے بعد لوگوں نے دیکھا کہ 150 گز لمبی اور 100 گز چوڑی جگہ بالکل ہموار ہو گئی ہے۔ لڑکوں نے ہاکی گراؤنڈ کے مطابق سفید چونے سے نشان لگا دیے تھے اور بانسوں کے گول پول بھی کھڑے کر دیے تھے۔

لوگوں نے لڑکوں کی ہمّت کی داد دی۔ اُسی شام عظمت نے راؤ صاحب کو گراؤنڈ کے افتتاح کے لیے بُلایا۔ راؤ صاحب قصبے کے مُعزّز لوگوں کے ہمراہ گراؤنڈ کے پاس پہنچے تو لڑکوں نے اُن پر پھول نچھاور کیے۔ راؤ صاحب گراؤنڈ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ان کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ گراؤنڈ لڑکوں نے تیار کی ہے۔ لڑکوں نے راؤ صاحب سے درخواست کی کہ ہماری ٹیم کو بھی ضلع کی سپورٹس کمیٹی میں رجسٹرڈ کر لیا جائے اور انہوں نے اسی وقت ٹیم کو رجسٹرڈ کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے علاوہ بچّوں کی محنت کو دیکھ کر انہوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ اس ٹیم کو ہاکی کا تمام سامان کمیٹی خرید کر دے گی۔ تمام حاضرین نے پُرزور تالیاں بجا کر راؤ صاحب کا شکریہ ادا کیا۔

دوسرے دن پوری ٹیم کا سامان عظمت کے گھر پہنچ گیا۔ اُس نے تمام لڑکوں کو جمع کیا اور سامان اُن میں تقسیم کر دیا۔ اُس نے لڑکوں سے کہا کہ اب ہماری کامیابی کا اِنحصار ہماری محنت پر ہے۔ اِس کے بعد سب لڑکے فجر کی نماز کے بعد پہلے ورزش کرتے اور بعد میں پریکٹس کرتے۔ آٹھ بجے گھر چلے جاتے۔ سہ پہر کو تین بجے پھر جمع ہو جاتے اور آپس میں میچ کھیلتے۔ عظمت نے چند دن بعد ٹیم کے تمام لڑکوں کے لیے سائیڈیں مقرر کر دیں اور خود سنٹرہاف کی پوزیشن پسند کی۔

ڈیڑھ ماہ کی پریکٹس کے بعد لڑکوں کا کھیل بہت بہتر ہو گیا۔ انہوں نے اِتفاقِ رائے سے عظمت کو کپتان مقرر کر دیا۔ اب علی پور کا ٹورنامنٹ بھی نزدیک آگیا تھا۔ اس ٹورنامنٹ میں ضلع بھر کی آٹھ ٹیمیں حصّہ لے رہی تھیں جن میں علی پور کی دونوں ٹیمیں بھی شامل تھیں۔ مینیجر جاوید کی ٹیم پول اے میں تھی جب کہ عظمت کی ٹیم پول بی میں۔

عظمت کی ٹیم نے اپنے تمام پول میچ جیت لیے۔ اُدھر جاوید صاحب کی علی پور الیون نے بھی صرف ایک میچ ہارا اور سیمی فائنل میں پہنچ گئی۔ سیمی فائنل میں بھی علی پور کی دونوں ٹیمیں جیت گئیں۔ جس دن فائنل میچ تھا، اُس دن علی پور میں میلے کا سا سماں تھا۔ دوسرے علاقوں سے بھی لوگ آئے ہوئے تھے۔ ضلع کے ڈپٹی کمشنر صاحب مہمانِ خصوصی تھے۔

راؤ صاحب نے مہمانِ خصوصی سے دونوں ٹیموں کا تعارُف کرایا۔ پھر وہ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئے۔ گراؤنڈ تماشائیوں سے کھچاکھچ بھرا ہوا تھا۔ آخر مقابلہ شروع ہوا۔ بڑا کانٹے دار میچ تھا جس میں عظمت کی ٹیم نے علی پور الیون کو دو کے مقابلے میں تین گول سے ہرا دیا۔ جونہی میچ ختم ہوا، تماشائی گراؤنڈ میں داخل ہو گئے اور جیتنے والی ٹیم کو کندھوں پر اُٹھا لیا۔

جاوید صاحب بہت شرمندہ تھے۔ یہ دیکھ کر عظمت اُن کے پاس گیا اور ہاتھ ملا کر کہا "سر، میری ٹیم بھی آپ ہی کی ٹیم ہے" یہ سن کر جاوید صاحب کو اپنے طرزِ عمل پر بڑا افسوس ہوا۔

آخر میں ڈپٹی کمشنر صاحب نے تالیوں کی گونج میں عظمت کو ٹرافی دی اور اُمید ظاہر کی کہ ایک دن یہ لڑکا ملک کا نام روشن کرے گا۔

ایک یادگار سفر

اطہر رضا۔ پُرانا لالوکھیت کراچی

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اور میں اپنی امی کے ساتھ ماموں کے گھر خانیوال جارہا تھا۔ پتا نہیں کیوں آج مجھے اپنا چھوٹا بھائی سلیم بہت یاد آرہا تھا۔ جو پانچ چھ سال پہلے گھر کے قریب کھیلتا ہوا غائب ہوگیا تھا۔ میں نے امی سے اُس کا ذکر کیا تو اُن کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

صُبح کو گاڑی ایک اسٹیشن پر رُکی تو ایک لڑکا ہاتھ میں چائے کی پیالیاں پکڑے ہماری طرف آیا اور امی سے بولا "اماں جی، چائے پیو گی؟" میں نے اُس کی طرف دیکھا تو کچھ جانا پہچانا سا لگا۔ امی بھی اُسے غور سے دیکھ رہی تھیں۔ اُس کی عُمر دس گیارہ سال کے لگ بھگ تھی۔

ابھی گاڑی کو یہاں آدھے گھنٹے تک رُکنا تھا۔ ہم نے سوچا کچھ کھا پی لیں۔ امی نے اُس لڑکے سے چائے لے لی اور جب وہ پیسے لے کر چلا گیا تو انہوں نے اُس کے ساتھی لڑکے کو بُلا کر پوچھا کہ تم اس لڑکے کو جانتے ہو۔ اُس لڑکے نے کہا کہ اماں جی، جب یہ چھوٹا تھا تو کوئی آدمی اسے اُٹھا کر لے جارہا تھا اور یہ زور زور سے رو رہا تھا۔ لوگوں نے پُوچھا کہ یہ رو کیوں رہا ہے تو وہ آدمی گھبرا گیا اور اسے پھینک کر بھاگنے لگا۔ لوگوں نے اُسے پکڑ کر پولیس کے حوالے کر دیا۔

بچّے نے اپنا نام سلیم بتایا۔ باپ کا نام اور گھر کا پتا نہ بتا سکا۔ ان لوگوں میں چاچا کرمُو بھی تھا جس کا اس اسٹیشن پر چائے کا اسٹال ہے۔ اس نے سلیم کو پالا پوسا اور جب وہ کام کرنے کے قابل ہوگیا تو اپنے ساتھ کام پر لگا لیا۔

یہ سُنتے ہی امّی کے مُنھ سے خُوشی کی چیخ نکل گئی اور اُنھوں نے نیچے اُتر کر اس لڑکے سے کہا کہ مجھے چاچا کرمُو کے پاس لے چلو۔ چاچا نے بھی وہی کہانی سُنائی جو اُس لڑکے نے سُنائی تھی۔ اُسی وقت سلیم بھی آگیا۔ امّی اُسے دیکھتے ہی آگے بڑھیں اور اُسے سینے سے لگا کر رونے لگیں۔ سلیم کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ جب امی نے اُسے ساری بات بتائی تو وہ بھی اُن سے لپٹ کر رونے لگا۔

اُسی وقت انجن نے سیٹی بجائی اور ہم گاڑی میں سوار ہوگئے۔ لیکن اب ہم دو نہیں، تین تھے۔

(پہلا انعام: 50 رُوپے کی کتابیں)

2

جویریہ مُنیر (پتا نہیں لکھا)

جب میں پانچویں جماعت میں تھی تو میرے والد کا تبادلہ حیدر آباد سے جہلم ہوگیا۔ اور ہم بذریعہ ریل جہلم روانہ ہوگئے۔

ہمارا سفر بہت خوش گوار گزر رہا تھا کہ ایک گھنٹے بعد ریل ایک جھٹکے سے رُک گئی۔ سب لوگ پریشان ہوگئے۔ میرے والد اور کچھ دوسرے مسافر گارڈ سے گاڑی کے رکنے کی وجہ پوچھنے لگے تو اُس نے بتایا کہ پٹڑی پر کچھ کٹے ہوئے درخت پڑے جل رہے ہیں۔ ابھی وہ یہ بتا ہی رہا تھا کہ اچانک فائرنگ شروع ہوگئی جس سے مسافروں میں بھگدڑ مچ گئی۔

ابُو بڑی مشکل سے واپس ڈبے میں آئے۔ گارڈ نے پُوری ٹرین کی بتّیاں بُجھا دیں اور لوگوں کو شور مچانے سے منع کر دیا۔ مگر عورتیں جو اپنی عادت سے مجبور تھیں شور مچاتی رہیں۔ گولیوں کی آوازیں اور لوگوں کا شور سُن کر ساتھ والے گاؤں سے لوگ کلہاڑے، ڈنڈے اور بندوقیں لے کر آگئے اور دونوں حریفوں کے درمیان دو تین گھنٹے تک لڑائی ہوتی رہی۔ لیکن خُدا کا شکر ہے کہ آخر کار ڈاکو اپنے گھوڑوں کی دُمیں دبا کر بھاگ گئے۔

جب کچھ امن ہوئی تو گاؤں کے لوگوں نے آگ بجھائی اور درخت پٹڑی سے ہٹانے گئے۔ ہم نے خُدا کا شکر ادا کیا کہ کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوا اور ٹرین بخیر و عافیت روانہ ہوگئی۔ تمام راستے لوگ دعائیں کرتے گئے کہ پھر کوئی ایسا واقعہ پیش نہ آئے۔ آخر ہم اگلے دن شام پانچ بجے جہلم پہنچ گئے۔

(دوسرا انعام: 45 روپے کی کتابیں)

3

کامران خان خیبر روڈ پشاور چھاؤنی

پچھلی گرمیوں کی چھٹیوں میں ابا جان نے ایک دن دفتر سے واپسی پر امّی سے کہا کہ بچّوں کی چھٹیاں ہو چکی ہیں۔ اس لیے وہ ہم سب کو سیر کرانے چترال لے جانا چاہتے ہیں۔

یہ سنتے ہی میں اور میری چھوٹی بہن پنکی خوشی سے ناچنے لگے۔ ابو اگلے دن جہاز کے ٹکٹ لے آئے اور ہم دو دن بعد پشاور کے ہوائی

اڈے سے فوکر جہاز میں چترال کی طرف روانہ ہو گئے اور تقریباً ایک گھنٹے کی پرواز کے بعد 12 بجے وہاں پہنچے۔ ادھر میرے پھوپھا جو فوج میں کیپٹن ہیں، ہمیں لینے آئے تھے۔ ان کے ساتھ جیپ میں بیٹھ کر دروش کی طرف روانہ ہوئے جہاں ان کا گھر تھا۔

دو دن آرام کرنے کے بعد پھوپھا جان نے پروگرام بنایا کہ ہمیں کافرستان کی سیر کرائی جائے۔ اگلے دن صبح ہم ان کی جیپ میں روانہ ہوگئے۔ دروش سے پہلے ہم گہریٹ بیریر گئے۔ وہاں سے آگے پہاڑی خطرناک راستہ شروع ہوتا ہے جو کافرستان کی وادیوں کی طرف جاتا ہے۔ یہ راستہ آگے جاکر دو حصّوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ پہلا کافرستان کی دو وادیوں، بریر اور رمبور کی طرف اور دُوسرا کافرستان کی سب سے حسین وادی ببوریت کی طرف جاتا ہے۔ ہم لوگوں نے ببوریت کی طرف جانے کا فیصلہ کیا۔

تقریباً دو گھنٹے کے خطرناک سفر کے بعد ہم ببوریت کی حسین وادی میں پہنچے۔ یہ وادی گویا زمین پر جنّت کا ایک ٹکڑا ہے۔ سرسبزو شاداب پہاڑوں کے درمیان سرسبزوادی تھی جس میں قسم قسم کے پھلوں کے درخت تھے اور درمیان میں چشموں کا میٹھا پانی تھا۔ وہاں ایک چھوٹا سا ہوٹل بھی تھا جس میں ہم نے چائے پی۔ سُرخ و سفید کافر عورتیں اور بچّے کالے لباس پہنے اور گلے اور سر کے بالوں میں قسم قسم کے موتیوں اور سیپیوں کے ہار ڈالے اِدھر اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔ ہوٹل کے پاس ہی ان کے گھر تھے۔ ہم ان کافروں کے گھر دیکھنے گئے جو بہت تنگ و تاریک تھے۔ ان میں کوئی کھڑکی اور روشن دان نہ تھا۔ ان کی عبادت گاہ کے آگے لکڑی کے دو بُت بنے ہوئے تھے۔

کافر لوگ بھیڑ بکری کا گوشت تو کھا لیتے ہیں، لیکن مُرغی اور انڈا نہیں کھاتے۔ مرد نکھٹّو ہوتے ہیں، اور عموماً آرام کرتے ہیں۔ کام کاج عورتیں کرتی ہیں۔ گاؤں کے ساتھ ہی ایک کھلے میدان میں قبرستان تھا۔ کافر اپنے مُردوں کو لکڑی کے کھلے تابُوت میں ڈال کر میدان میں رکھ دیتے ہیں۔ ہم لوگوں نے تابوتوں میں مُردوں کی ہڈیاں دیکھیں۔

کافر لوگ سال میں دو جشن مناتے ہیں۔ ان دنوں کافر مرد اور عورتیں ناچتے اور گاتے ہیں اور غیر ملکی لوگ بھی یہ جشن دیکھنے آتے ہیں۔ باوجود اس کے کہ وادی میں پانی کے چشمے ہیں، پھر بھی کافر لوگ مہینوں نہیں نہاتے اس لیے ان کے جسم سے بہت بد بُو آتی ہے۔ ہم لوگوں نے کافروں کے گھروں اور وادی کی تصاویر لیں اور پھر اس کے بعد چترال میں ایک ہفتہ گزارنے کے بعد واپس پشاور آ گئے۔ چترال کا یہ سفر میری زندگی کا ایک یادگار سفر تھا۔

(تیسرا انعام: 40 رُوپے کی کتابیں)

4

محمد کاشان انصاری، پاک کالونی کراچی

گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم سب بہن بھائیوں نے حیدر آباد جانے کا پروگرام بنایا۔ یہ رمضان کا مہینا تھا اور روزے ختم ہونے میں تین دن باقی تھے۔ جُمعرات کے دن ہم نے ایک ٹیکسی لی اور پھر اسٹیشن پہنچ گئے۔ ریل آنے میں ابھی پندرہ منٹ تھے۔ ابُّو ٹکٹ لینے چلے گئے اور ہم پلیٹ فارم پر ایک جگہ بیٹھ گئے۔

کچھ دیر بعد اعلان ہوا کہ ریل آدھا گھنٹہ لیٹ ہے۔ ادھر ہمارا گرمی سے بُرا حال تھا۔ خیر اللہ اللہ کر کے یہ آدھا گھنٹہ بھی گزر گیا اور تھوڑی دیر بعد ریل آگئی۔ اسٹیشن پر ہل چل مچ گئی۔ ہم نے بھی جلدی سے چڑھ کر ایک سیٹ گھیر لی۔ اور چند منٹ بعد ریل روانہ ہوگئی۔ جب گاڑی دوسرے اسٹیشن پر رکی تو وہاں سے بھی کافی آدمی سوار ہوئے اور ان آدمیوں میں کچھ ڈاکو بھی تھے۔ لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ ڈاکو ہیں۔ کچھ دیر بعد ریل چل دی۔ تھوڑی دیر گزری ہوگی کہ ان ڈاکوؤں نے مسافروں پر پستول تان لئے اور کہا کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے ہمارے حوالے کر دو۔ سب لوگ ڈر کے مارے چیخنے لگے۔ میں بھی ایک کونے میں بیٹھا رو رہا تھا۔ جب لوگوں نے اپنا مال ڈاکوؤں کے حوالے کر دیا تو ان کے سردار نے زنجیر کھینچ دی۔ جس سے ریل رک گئی اور ڈاکو فرار ہو گئے۔

گارڈ سب ڈبوں کو چیک کرتا ہوا ہمارے ڈبّے میں آیا تو ہم نے اسے اپنی درد بھری کہانی سنائی۔ لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ ریل دوبارہ چل دی۔ سب کو اپنا مال چھن جانے کا بڑا افسوس تھا۔ جب ہم حیدر آباد کے اسٹیشن پر پہنچے تو ہمارے چچا ہمیں لینے آئے ہوئے تھے۔ ہم ان کے ساتھ ان کے گھر گئے اور انہیں اپنے لٹنے کا حال بتایا۔ انہوں نے شکر ادا کیا کہ جانیں بچ گئیں۔

پھر دو دن بعد عید آگئی۔ اور ہم نماز پڑھنے عید گاہ گئے۔ نماز کے بعد سب ایک دوسرے سے عید ملنے لگے۔ جب میں اپنے بھائی سے عید ملنے لگا تو میری نظر ایک شخص پر پڑی۔ اسے دیکھتے ہی میں نے ایک دم شور مچایا "ڈاکو! ڈاکو! ڈاکو! پکڑو! پکڑو" مگر وہ شخص نمازیوں کی بھیڑ میں غائب ہوگیا۔ یہ شخص ان ڈاکوؤں کا سردار تھا۔ جنہوں نے ہمیں

لوٹا تھا۔ یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ لوگ ایک ہی وقت میں دو کام کیسے کرتے ہیں؟ خُدا ایسے بھٹکے ہوئے لوگوں کو سیدھی راہ پر لائے اور انہیں حق حلال کی روزی کمانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

(چوتھا انعام: 35 رُوپے کی کتابیں)

5

محمد فاروق ۔منگلا ڈیم

میری حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی جب ابّو نے مجھے آزاد کشمیر کے سفر پر اپنے ساتھ لے جانے کی ہامی بھرلی۔ دُوسرے ہی دن ہمیں روانہ ہونا تھا۔ وہ رات حسین خواب دیکھتے گزری اور صبح سویرے نماز فجر سے فارغ ہو کر ہم سب سفر کی تیاری میں ابّو کا ہاتھ بٹانے لگے۔ آٹھ بجے ڈرائیور جیپ لے کر آگیا۔ ہم نے سامان جیپ میں رکھا اور گھر والوں کو خدا حافظ کہہ کر جیپ میں سوار ہو گئے۔

ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے منگلا سے روانہ ہوئے۔ جیپ دینہ اور گوجر خان سے ہوتی ہوئی شاہراہ اسلام آباد پر فرّاٹے بھرتی جارہی تھی۔ سامنے اسلام آباد کا خوب صورت شہر تھا۔ فیض آباد سے ہم مری کی طرف مڑ گئے اور تھوڑی دور چل کر پہاڑی علاقے کا سفر شروع ہو گیا۔ پہلے تو میں نے خوف سا محسوس کیا، پھر حسین مناظر میں کھوگیا۔

یہ جون کا ایک بہت ہی گرم دن تھا۔ سورج زمین پر آگ برسا رہا تھا اور بادل کے صرف چند ٹکڑے سورج کے گرد گھیرا ڈالنے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ ڈرائیور نہایت ہوشیاری سے پُرپیچ پہاڑی سڑک پر جیپ دوڑا رہا تھا۔ جب ہم ملکۂ کہسار مری پہنچے تو گرمی سے نڈھال جسم میں جیسے جان سی آگئی۔ مجھے عجیب قسم کی خنکی اور فرحت کا احساس ہوا۔ ملک کے کونے کونے سے آئے ہوئے لوگ زرق برق کپڑوں میں ملبوس مری کے حسن سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہم تھوڑی دیر مری میں ٹھہرے اور اس دوران بادل کے ٹکڑوں نے گھن گھور گھٹا کی شکل اختیار کرلی اور دیکھتے ہی دیکھتے جَل تھل ایک ہوگیا۔ بارش میں دُھل کر پہاڑی مناظر کچھ اور حسین ہو گئے تھے۔

ڈرائیور جیپ آہستہ آہستہ اور احتیاط سے چلا رہا تھا۔ جب ہم لوئر ٹوپہ پہنچے تو بارش رُک گئی اور بادل جیسے پہاڑوں پر اُتر آیا یوں لگتا تھا کہ ہم بادلوں میں سفر کر رہے ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ بادل چھٹنے لگے۔ یہ منظر اتنا دل فریب تھا کہ میں اس میں گم سا ہوگیا۔ ہم نے کوہالہ کے مقام پر دریائے جہلم کا پُل عبور کیا۔ یہاں سے آزاد کشمیر شروع ہو جاتا ہے اور اس کا دارالحکومت مظفر آباد یہاں سے تقریباً 36 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہاں ہی سے ایک سڑک دھیر کوٹ کے راستے باغ کو جاتی ہے۔

جب ہم مُظفر آباد پہنچے تو سورج بلند و بالا پہاڑوں کے پیچھے چھُپ گیا تھا اور مظفر آباد رنگ برنگی روشنیوں میں ڈوبا عجب طلسماتی منظر پیش کر رہا تھا۔ ہمیں وادیٔ جہلم میں دریائے جہلم کے کنارے بنے ایک ہٹ میں قیام کرنا تھا۔ جب ہم وہاں پہنچے تو رات نے سارے علاقے کو اپنے دامن میں چھپا لیا تھا۔ اگرچہ وہاں دریائے جہلم کا شور بہت تھا مگر میں بہت تھکا ہوا تھا۔ اس لئے کھانا کھاتے ہی لیٹا اور سو گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو وادی فجر کی اذانوں سے گونج رہی تھی۔ میں نے نماز پڑھی اور دریا کنارے ٹہلنے کے لئے نکل گیا۔ مشرق پر نمودار ہونے والی سُرخی سورج کے طلوع ہونے کی اطلاع دے رہی تھی۔ مگر اونچے پربتوں کے عقب سے سورج کی کرنیں کچھ دیر بعد وادی کو منور کرتی ہیں۔ جب میں واپس آیا تو ناشتا لگا دیا گیا تھا اور ابّو میرا انتظار کر رہے تھے۔ ناشتے کے دوران ابّو نے بتایا کہ دریا کے اس پار مظفر آباد کا ہوائی اڈا ہے، جہاں روزانہ راولپنڈی سے پی۔ آئی۔ اے کی ایک پرواز آتی ہے۔

اس دن ہم وادیٔ جہلم میں چناری تک گئے۔ یہ جگہ مظفر آباد سے تقریباً 50 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ راستے میں چھوٹے چھوٹے کئی قصبے آئے جن میں گھڑی دوپٹہ اور ہٹیاں بالا زیادہ مشہور ہیں۔ یہاں فلک بوس سرسبز پہاڑوں سے گھری وادیٔ جہلم جنّت کا نمونہ پیش کرتی ہے اور اونچے پربتوں سے گرتے جھرنوں کی صدائیں کانوں میں رس گھولتی ہیں۔ اس وادی میں سیب، اخروٹ اور خوبانی کے باغات بکثرت ملتے ہیں۔

چناری سے ہم رات کو واپس ہٹ میں آگئے اور دوسرے دن مظفر آباد کی سیر کی جو نہایت خوبصورت عمارتوں کا شہر ہے۔ دریائے جہلم پر قائداعظم برج کے نام سے ایک پُل تعمیر کیا گیا ہے۔ اسی دن ہم منگلا کے لئے روانہ ہو گئے۔ واپسی پر تمام وقت ان خوبصورت مناظر کی ایک فلم سی میرے ذہن میں چلتی رہی۔ اس یادگار سفر کے بعد جب ہم واپس لوٹے تو کئی دنوں تک میں اس سفر کی یادوں میں کھویا رہا۔

(پانچواں انعام: 30 رُوپے کی کتابیں)

6

ذی شان الحق عزیز پشاور

مجھے بچپن ہی سے جہاز کے سفر کا بہت شوق تھا۔ جب چھوٹا سا تھا تو آسمان پر اُڑتے جہاز کو بڑی حسرت سے دیکھا کرتا تھا۔ مگر ابھی تک کبھی جہاز میں سوار ہونے کا موقع نہیں ملا تھا۔ لیکن پچھلے سال گرمیوں کی چھٹیوں میں میری یہ حسرت پوری ہوگئی۔

ان دنوں میری دادی اماں ملتان میں تھیں۔ انہوں نے مجھے اپنے پاس بُلایا۔ میں اکیلا تھا اور راستہ بُہت طویل اس لیے ابُو نے مجھے جہاز کے ذریعے بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ یہ سُن کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ جس دن مجھے روانہ ہونا تھا، اس دن صبح سویرے اُٹھا اور تیار ہو کر ابُو کے ساتھ ائر پورٹ روانہ ہوگیا۔ پورے آٹھ بجے ہمارے جہاز نے ٹیک آف کیا اور کچھ ہی دیر میں ہوا سے باتیں کرنے لگا اس وقت میں یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ میں زمین سے کئی ہزار فٹ بلند ہوں۔ نیچے سڑکیں اور مکانات بہت خوب صورت منظر پیش کر رہے تھے۔ سڑکوں پر چلتی گاڑیاں بالکل کھلونوں کی مانند نظر آرہی تھیں۔ ہر طرف سبزہ ہی سبزہ تھا۔ بالکل یوں لگتا تھا جیسے میں پریوں کے دیس میں آگیا ہوں۔

کچھ دیر بعد ائر ہوسٹس نے ہمیں سینڈوچ اور چائے پیش کی۔ اس کے بعد ہمارا جہاز ژوب (بلوچستان) کے ہوائی اڈے پر ایندھن لینے کے لئے رُکا میں سمجھا کہ یہ ملتان ہے خوشی خوشی باہر آیا مگر کسی کو نہ پایا تو تمام حقیقت مجھ پر واضح ہوگئی لہٰذا بھاگا بھاگا جہاز کے اندر گیا۔

کچھ دیر بعد جہاز کا دروازہ بند ہوگیا اور وہ ٹیک آف کر گیا۔ مُلتان کے تمام راستے کے دوران دھواں دھواں نظر آرہا تھا میں نے ائر ہوسٹس سے پوچھا کہ یہ دُھواں کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ یہ بادل ہیں۔ میں حیران ہوگیا کہ ہم بادلوں کے اوپر اُڑ رہے ہیں۔

چالیس منٹ بعد ہمارا جہاز ملتان کے ہوائی اڈے پر اُتر گیا جہاں دادی اماں مجھے لینے کے لئے آئی ہوئی تھیں۔

یہ میری زندگی کا پہلا ہوائی سفر تھا اور میں اسے زندگی بھر فراموش نہیں کر سکوں گا۔ (چھٹا انعام: 25 رُوپے کی کتابیں)

اِن ہونہار ادیبوں کی کہانیاں بھی اچھی ہیں۔ انہیں 15, 15 رُوپے کی کتابیں دی گئیں ہیں:

محمّد احمد خان، ڈان باسکو ہائی سکول لاہور۔ عشرت خالق، ریواز گارڈن لاہور۔ محمّد امین، النُور ٹاؤن لاہور چھاؤنی۔ عُمیرہ مبارک، راوی روڈ لاہور۔ ساجدہ خورشید الحسن، ایس او ایس چلڈرن ویلج لاہور۔ نوشابہ قیوم، مصطفیٰ آباد لاہور۔ سجیل جیب، رحمان پُورہ لاہور۔ محمد صدیق، کریم پارک لاہور۔ ثروت ممتاز، نیو کراچی۔ عرفان کریم، امین آباد کراچی۔ مرزا آصف بیگ، گھاڑی کھاتہ حیدر آباد۔ روبینہ کوثر، نارتھ ناظم آباد کراچی۔ شائستہ انجم، یاسین آباد کراچی۔ فرحان ظفر، جیکب لائن کراچی۔ محمد یُونس حُسین، ناظم آباد کراچی۔ زینت خان، محمد بلوچ میر پُور خاص۔ محمد صلاحُ الدین سکھر۔ خیر محمد خان، عوامی کالونی کراچی۔ محمّد سُہیل، حُسین آباد کراچی۔ اِرم بشیر، کراچی۔ محمّد صادق، ریاض سُعودی عرب۔ اصغر خان آفریدی، خیبر ایجنسی۔ شاہ اِرم نیاز، ڈیرہ اسماعیل خان۔ مُحمد رضوان، سرائے صالح۔ عظیم بِن فُرقان، مردان۔ عظمیٰ کریم، پشاور چھاؤنی۔ سجّاد خان، چمکنی پشاور۔ ہُما قیوم، بڈھ بیر پشاور۔ زُبیر حُسین شاہ، میانوالی۔ محمّد منظر رضا، علی پُور ضلع مظفر گڑھ۔ نوشابہ اکرم، رحیم یار خان۔ نعیم افضل، اسلام آباد۔ طارق محمُود، شام کوٹ۔ محمد امین، سرائے عالم گیر۔ صائمہ نصراللہ، پیپلز کالونی فیصل آباد۔ حمنہ اقبال، گہلن ضلع قصُور۔ ثمینہ کوثر، کنک منڈی راولپنڈی۔ سائرہ صدیق، اسلام آباد۔ محمد پرویز کُندی، کُندیاں۔ رانا سُہیل احمد، بھلوال۔ شازیہ محمد حسن، ملکہ ہانس پاکپتن۔ طاہر سلیم، سیالکوٹ۔ محمد طلحہ الماس، اسلام آباد۔ سعید اختر جنجوعہ، ملتان۔ نائمہ ظہیر راولپنڈی۔ خالد اقبال، بھکر۔ ثوبیہ شوکت، صدر راولپنڈی۔ خالد محمُود، جاوید ٹاؤن اوکاڑا۔ سیّد عاطف حُسین شاہد گڑھ قائم ضلع گجرات۔ محمد عاشق، احمد پُور شرقیہ۔

آپ بھی لکھئے

مندرجہ ذیل موضوعات پر کہانی لکھئے اور ایک ہزار روپے کے انعامات حاصل کیجئے

جولائی ☆ ہم نے آم کھائے۔ اگست: جب ہم آزاد ہوئے

(آخری تاریخ 10 جُون)

ایڈیٹر تعلیم وتربیت 32 شارع بن بادیس لاہور

دماغ لڑاؤ

داؤدی علمی آزمائش

1- آل انڈیا کانگرس کا بانی کون تھا؟ اور کس سن میں قائم کی گئی تھی ؟
2- آل انڈیا مسلم لیگ کا پہلا صدر کس کو منتخب کیا گیا تھا ؟
3- مسلمانوں کو کانگرس میں شریک نہ ہونے کا مشورہ کس نے دیا تھا ؟
4- قائداعظم کو پیامبرِ اتحاد کا لقب کس نے دیا تھا ؟
5- محمد علی جناح کو قائداعظم کا خطاب کس نے اور کہاں دیا تھا ؟
6- تقسیم بنگال کا فیصلہ کب اور کس وائیسرائے کے عہد میں ہوا تھا؟
7- مولانا محمد علی جوہر نے مرنے سے پہلے کیا اعلان کیا تھا؟
8- مسز اینی بیسنٹ نے جو تحریک چلائی تھی اس کا کیا نام تھا ؟
9- کیا قائداعظم اس تحریک میں شریک ہوئے تھے ؟
10- کرپس مشن میں کتنے ارکان شامل تھے ؟
11- وزارتی مشن کے ارکان کے نام بتایئے۔
12- اس گورنر کا نام بتایئے جس کی تقریب میں قائداعظم نے بمبئی میں ہنگامہ برپا کرایا تھا۔
13- بتایئے یہ کس کا مصرعہ ہے ؟

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح

14- جنرل بخت خان کا شجاع الدولہ کے خاندان سے کیا تعلق تھا؟
15- فرخ آباد کے نواب تجمل حسین خاں کے متعلق مرزا غالب نے کہا تھا:

دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے
بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لیے

بتایئے 1857ء کی بغاوت کے بعد انہوں نے کہاں زندگی بسر کی ؟

ماہ مئی کے کامیاب بچے

قرعہ اندازی سے حسب ذیل دوست پہلے تین انعامات کے حق دار قرار پائے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی اکتیس کامیاب بچوں کو پچیس، پچیس روپے کی کتب انعام میں مبارک ہوں۔

1- محمد طارق احمد 475 بلاک - کیو، ماڈل ٹاؤن لاہور۔(100 روپے کی کتب)
2- نبیل شاہین محلہ اسلام پورہ سیالکوٹ۔(75 روپے کی کتب)
3- حافظ محمد عرفان علی جرال 121 - بی بلاک - ماڈل ٹاؤن توسیعی سکیم لاہور۔(50 روپے کی کتب)

پچیس، پچیس روپے کی کتب انعام پانے والے خوش نصیب دوست

1- راشد کمال 177/R ماڈل ٹاؤن لاہور۔
2- سلطان بشیر 16 - ڈی گلی، نمبر 56 جی - 64 - اسلام آباد۔
3- عالیہ عفت، گلی نمبر 11، مکان نمبر 85، کیٹگری 2 سیکٹر I-8 اسلام آباد۔
4- وردہ اقبال اسلامیہ پارک لاہور۔
5- فوزیہ قادری، عثمان آباد۔ ملتان۔
6- عائشہ تزمین، نزد حاج محل سینما ایبٹ آباد۔

7- ثاقب حسین زیدی، مکان 680/42 گلی نمبر 73 بزاز محلہ صدر بازار لاہور کینٹ۔
8- سیف اللہ ولد عطاالرحمٰن، چک نمبر 301 ج۔ ب۔ تحصیل گوجرہ ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ۔
9- حسن ارسلان۔ ای۔ 31 پنجاب یونیورسٹی لاہور۔
10- نوشین مسعود نذیر، علامہ اقبال ٹاؤن لاہور۔
11- جمال عبدالناصر ولد محمد شفیق، محلہ عالم شاہ نمبر 2 پنڈ دادنخان۔ ضلع جہلم۔
12- ریاض احمد ولد عبدالحفیظ گلی نمبر 9 طارق کالونی شہباز خاں روڈ قصور۔
13- راجیش جیون مل، جماعت ہفتم۔ اے دستگیر آئیڈیل ہائی سکول گوجرانوالہ۔
14- محمد اسعد حنیف، مکان نمبر 33 - بلال اسٹریٹ علامہ اقبال کالونی (ننھے بھائی) راولپنڈی کینٹ۔
15- عروج نصراللہ، 420/B پیپلز کالونی نمبر 1 فیصل آباد۔
16- افتخار بختی، گلی نمبر 73 مکان 680/36 بزاز محلہ۔ صدر بازار لاہور کینٹ۔
17- محمد اسد صدیق، الصدیق، آبادی پیر بہار شاہ شیخوپورہ۔
18- سید حماد افضل، 18 - بی۔ گلگشت کالونی۔ ملتان۔
19- محمد فاروق، مکان D-2/7، لفٹ بنک کالونی منگلا ڈیم۔ ضلع جہلم۔
20- شعیب محسن ملک، معرفت فیض ٹی سٹال شادمان کالونی ہائیکورٹ روڈ۔ ملتان۔
21- مریم مشتاق خاں۔ شمالی محلہ جہلم۔
22- شاہد ضیا، 219 کوثر بلاک، اعوان ٹاؤن، ملتان روڈ لاہور۔
23- مریم منیر۔ باغبان پورہ، لاہور۔
24- رفعت خاں، معرفت ڈاکٹر حضر حیات خاں نیازی، فلور کوٹ۔ ضلع بھکر۔
25- خواجہ حسن بلال، 100 ہارلے سٹریٹ۔ راولپنڈی۔
26- عامر غفور، مکان نمبر 978/11 محلہ پرانا ہسپتال نوشہرہ۔ ضلع پشاور۔
27- قسور حسین انجم، گورنمنٹ ہائی سکول جماعت ہشتم۔ بی۔ قادر پوران۔
28- عدیل احمد، مکان نمبر 28/10 ریاض کالونی۔ بہاولپور۔
29- عامر اشرف ولد ماسٹر محمد اشرف گھمن، .S.S.T گورنمنٹ ہائی سکول سادوکی تحصیل وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ۔
30- عاصم قدان، معرفت نور محمد، سٹریٹ نمبر 13 مکان نمبر 6 کاچھو پورہ، لاہور۔
31- محمد نعمان انجم، معرفت چودھری عباس علی ایس۔ ایس گورنمنٹ ایلیمنٹری ٹیچرز ٹریننگ کالج سرگودھا۔

آئیے دوست بنائیں

وقاص احمد 14 سال
کتابیں جمع کرنا
صادق پبلک سکول ،
بہاول پور ۔

غیاث الدین 11 سال
کرکٹ ، مطالعہ
بمقام ڈاک خانہ ونہار تحصیل تلہ گنگ
ضلع چکوال ۔

سلیم عباس 14 سال
مطالعہ کرنا
معرفت شیخ غلام عباس منیجر باٹا شوز
سٹور ، سیالکوٹ کینٹ ۔

نوید احمد خان جتوئی 9 سال
قلمی دوستی
جتوئی ہاؤس قائداعظم کالونی نزد
ریلوے اسٹیشن بہاول پور ۔

محمد عتیق 12 سال
رسالے پڑھنا
محلہ عثمان پارک فرید ٹاؤن ،
گلی نمبر 74 گوجرانوالہ ۔

محمد حسن معظم 7 سال
ہاکی کھیلنا ، رسائل پڑھنا
458 رضا بلاک علامہ اقبال
ٹاؤن لاہور ۔

تنویر احمد 13 سال
مطالعہ اور کرکٹ
فضل کاٹن جننگ فیکٹری ،
رحیم یار خان ۔

شہزاد علی 13 سال
فٹ بال ، قلمی دوست
33 گلی نمبر 1 کیولری گراؤنڈ
لاہور ۔

عبدالعلیم اعوان 14 سال
کرکٹ کھیلنا ، ٹکٹ جمع کرنا
293/2 اپر ملک پورہ گاگی
محلہ ، ایبٹ آباد ۔

سید ذوالفقار الحسنین شاہ 12 سال
ٹکٹ اور سکے جمع کرنا
گلبہار نمبر 3 عشرت سینما روڈ نزد
گلبہار فلور ملز پشاور شہر ۔

عظمت علی 15 سال
سکے جمع کرنا ، قلمی دوستی
فارم گاؤں قاسم ڈاک خانہ ترناب
تحصیل نوشہرہ ضلع پشاور ۔

تنویر احمد اعوان 13 سال
مطالعہ کرنا
معرفت نصیر احمد اعوان چک نمبر
142/9-L ضلع ساہیوال ۔

غلام نبی اجمیری 16 سال
کرکٹ
پاکستان ٹرنک ہاؤس شاہی بازار
میر پور خاص ۔

فاروق حیات 10 سال
ٹکٹ جمع کرنا
251 رضا بلاک علامہ اقبال
ٹاؤن لاہور ۔

وقاص احمد 12 سال
پڑھنا
یزدانی میٹرنٹی ہوم جناح پارک
فوجی ہسپتال رحیم یار خان ۔

محمد عظیم بٹ 10 سال
ٹکٹ جمع کرنا
178/B سرسید روڈ ،
راولپنڈی کینٹ ۔

پرمانند کمار 10 سال
کرکٹ کھیلنا ، کہانیاں پڑھنا
جانکی رام شیوک رام شاہی بازار
پنوں عاقل ۔

شہزاد الرحمن 10 سال
کرکٹ
86 ۔ علامہ اقبال روڈ نزد
علی المراد ہائی سکول ۔

آصف صفدر ملک 16 سال
سائنسی معلومات جمع کرنا ، تجربات کرنا
صفدر علی ملک مکان نمبر 6 محلہ
پٹیلاں شرقپور ، ضلع شیخوپورہ ۔

محمد عمران شہزاد 10 سال
فٹ بال کھیلنا
چوہدری نصیر محمد ایڈووکیٹ سول لائنز
روڈ نزد نشاط ہائی سکول ملتان ۔

ناصر علی جعفری 15 سال
مصوری ، قلمی دوستی
محلہ محمد پورہ پرانی جی ٹی سرجیکل
سیالکوٹ ۔

عمار اقبال 10 سال
فٹ بال ، مطالعہ ، قلمی دوستی
معرفت مسز عائشہ طلعت "النائلہ"
30 ۔ کاگان کالونی ایبٹ آباد ۔

عثمان غازی 10 سال
مطالعہ کرنا
معرفت السید ہاسٹل ،
ایبٹ آباد ۔

آئیے دوست بنائیں

جون : 1989

قلمی دوستی کی اس محفل میں شریک ہونے کے لیے
یہ کوپن پُر کرنا اور تصویر بھیجنا ضروری ہے۔
(لڑکیاں اس میں حصہ نہیں لے سکتیں ۔)

نام ________ عمر ________

مشاغل ________

پتا ________

سدُومیوں کا ہولناک انجام

ڈاکٹر عبدالرؤف

حضرت لُوطؑ خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے۔ آپؑ لوگوں کو ایک خُدا کی عبادت اور نیک کاموں کی تلقین کیا کرتے تھے۔ آپ آج سے تقریباً دو ہزار برس پہلے شہر سدُوم میں رہتے تھے۔ سدُوم کے لوگ منجھے ہوئے بدمعاش تھے۔ مار دھاڑ، چوری چکاری، لوٹ مار، اور دھوکہ دہی اُن کے محبوب مشاغل تھے۔

حضرت لوطؑ نے اُنہیں بُہتیرا سمجھایا بُجھایا۔ اُن کی اصلاح کے ہزار جتن کیے۔ مگر بدبخت سدُومی اپنی غلط رَوش سے بالکل باز نہ آئے۔ وُہ چاہتے تھے کہ حضرت لوطؑ اُن کے مشاغل میں کسی قسم کی دخل اندازی نہ کریں۔ چنانچہ جُوں جُوں دن گزرتے گئے سدُومی حضرت لُوطؑ کے جانی دشمن ہوتے چلے گئے۔

جب حضرت لُوطؑ سدُومیوں کی اِصلاح سے بالکل مایُوس ہو گئے تو خداوند تعالیٰ نے اُن لوگوں کو تباہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ نوجوانوں کے رُوپ میں تین فرشتے سدُوم کی ہونے والی تباہی کے بارے میں حضرت لُوطؑ کو خدا کے فیصلے سے آگاہ کرنے کیلئے اُن کے گھر آپہنچے۔

حضرت لوطؑ نے اُنہیں عام مہمان سمجھ کر اُن کی خاطر مدارت کا خوب اہتمام کیا۔ مگر فرشتوں نے کھانے پینے میں تامّل کا اظہار کیا۔ اس پر حضرت لُوطؑ کو تشویش ہوئی۔ حضرت لوطؑ کو پریشان دیکھ کر فرشتوں نے اُنہیں صاف صاف بتا دیا کہ وُہ دراصل فرشتے ہیں اور اُنہیں سدُوم کی تباہی کے متعلق اللہ تعالیٰ کے فیصلہ سے آگاہ کرنے آئے ہیں۔

اُدھر شہر میں یہ خبر گرم ہو چکی تھی کہ حضرت لُوطؑ کے ہاں تین مہمان وارد ہوئے ہیں۔ بس پھر کیا تھا سدُومی لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ حضرت لُوطؑ کے مکان کے باہر جمع ہو گئے اُن کا مطالبہ تھا کہ مہمان فوراً اُن کے حوالے کر دیئے جائیں۔ حضرت لوطؑ نے اُنہیں بُہتیرا سمجھایا کہ وہ اپنے مطالبے سے باز آجائیں۔ مگر وُہ ایک نہ مانے حضرت لُوطؑ بہت مایوس اور بے حد متفکّر ہوئے۔

فرشتوں نے حضرت لُوطؑ کو تسلّی دی کہ آپ قطعی نہ گھبرائیں اور اُن کے ساتھ مکان کے پچھلے دروازے سے نکل جائیں۔ چنانچہ حضرت لُوطؑ اُن کے مسلمان اہلِ خانہ اور فرشتے سدُوم سے نکل کر کسی اور محفوظ مقام پر جا پہنچے۔ اس کے فوراً بعد سدُوم کی تباہی کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے ایک ہولناک زلزلہ آیا، جس سے سارا شہر لرز اُٹھا۔ عمارتوں کے گرنے اور لوگوں کی چیخ پکار نے قیامت کا سماں باندھ دیا۔ پھر آسمان سے پتّھروں کی شدید بارش برسنے لگی۔ اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے سارا شہر اور اس کے تمام باشندے موت کی آغوش میں سو گئے۔

سپورٹس

گاف

نديم احمد

گاف گیند سے کھیلا جانے والا کھیل ہے جسے کسی باغ یا بڑے، میدان میں کھیلتے ہیں ۔ جس باغ یا میدان میں گاف کا کھیل کھیلا جاتا ہے وہ 50 سے 300 ایکڑ رقبے پر مشتمل ہوتا ہے ، جس میں لمبے لمبے درختوں ، بڑی بڑی گھاس ، ریتلی زمین اور پانی کی رکاوٹیں ہوتی ہیں ۔ گاف کے ایسے وسیع میدان میں مختلف مقامات پر سُوراخ ہوتے ہیں جن میں بلّے کی مدد سے گیند کو ڈالنا مقصود ہوتا ہے ۔

گاف کی چھوٹی سی گیند کا رنگ سفید ہوتا ہے جس پر ربڑ کا چِھلکا چڑھا ہوتا ہے ۔ گاف میں استعمال ہونے والے بلّے شکل اور وضع کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں ۔ گیند کو دور پھینکنے کے لیے جو بلّا استعمال ہوتا ہے اُسے "ڈرائیور" (Driver) کہتے ہیں ۔ درمیانی فاصلے تک گیند پھینکنے کے لیے لوہے کا بلّا "آئیرن" (Iron) استعمال ہوتا ہے اور جس بلّے سے گیند کو سُوراخ میں ڈالتے ہیں اُسے "پٹر" (Putter) کہتے ہیں ۔

گاف کے کھیل میں گیند کو سوراخوں میں ایک ترتیب سے ڈالا جاتا ہے اور ہر کھلاڑی کی کوشش ہوتی ہے کہ کم سے کم "سٹروک" لگا کر تمام سوراخوں میں گیند ڈال دے ۔ اس کھیل کا ہر کھلاڑی اپنی ہار یا جیت کا ذاتی طور پر ذمّہ دار ہوتا ہے ۔ جس وقت کھلاڑی سٹروک لگا رہا ہوتا ہے اور گیند باری باری سوراخوں میں ڈال رہا ہوتا ہے اُس وقت کوئی مخالف کھلاڑی اس کے کھیل میں مداخلت نہیں کر سکتا ۔ یہ کھیل دو یا دو سے زیادہ افراد کے ساتھ کھیلا جاتا ہے اور مخالف ٹیموں کے درمیان بھی کھیلا جا سکتا ہے ۔ یہ کھیل مردوں کے علاوہ عورتیں بھی کھیل سکتی ہیں ۔

گاف کا کھیل دُنیا بھر میں کھیلا جاتا ہے ۔ جدید گاف کے آغاز کا سہرا سکاٹ لینڈ کے سَر ہے ۔ 15 ویں صدی کے وسط میں گاف سکاٹ لینڈ میں اس قدر اہم کھیل سمجھا جاتا تھا کہ جیمز دوئم نے اپنی پارلیمنٹ سے کہا کہ اس کھیل پر خصوصی توجہ دی جائے ۔

گاف کے قواعد و ضوابط مشترکہ طور پر "رائل اینڈ اینشنٹ گاف کلب آف سکاٹ لینڈ" اور "یونائیٹڈ اسٹیٹس گاف ایسوسی ایشن" نے وضع کیے ۔ رائل اینڈ اینشنٹ گاف کلب 1754 میں

قیام پذیر ہوئی اور پوری دُنیا میں اسی کلب کے وضع کردہ قواعد و ضوابط کے مطابق گاف کا کھیل کھیلا جاتا ہے ۔ امریکہ میں گاف "یونائیٹڈ سٹیٹس گاف ایسوسی ایشن" کے وضع کردہ اصولوں پر کھیلا جاتا ہے ۔

سب سے پہلی نیشنل گاف چیمپین شپ 1860 میں سکاٹ لینڈ میں منعقد ہوئی ۔ آغاز میں تو یہ چیمپین شپ مُلکی پیشہ ور کھلاڑیوں تک محدود کر رہی لیکن 1865 میں اس چمپین شب کا دائرہ پوری دُنیا تک وسیع کر دیا گیا اور اس چیمپین شب کا نام "برٹش اوپن چیمپین شپ" رکھ دیا گیا ۔ عورتوں کے لیے "برٹش ویمن امیچور گاف چیمپین شپ" کا آغاز 1883 میں کیا گیا ۔ عورتوں کے لیے سب سے پہلی اوپن چیمپین شپ 1946 میں منعقد کی گئی ۔ یہ چیمپین شپ "یونائیٹڈ سٹیٹس گاف ایسوسی ایشن" کے تعاون سے منعقد کروائی گی ۔

1916 میں پیشہ ور کھلاڑیوں کے لیے "پروفیشنل گاف ایسوسی ایشن آف امریکہ" کا قیام عمل میں آیا جو ہر سال ٹورنامنٹ منعقد کرواتی ہے ۔ اسی قسم کی ایک ایسوسی ایشن عورتوں کے لیے 1955 میں قائم کی گئی ۔ 1934 میں "ماسٹرز ٹورنامنٹ" کا آغاز "آگسٹ نیشنل گاف کلب" نے کیا ۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد گاف کا کھیل کالجوں اور سکولوں میں بھی کھیلا جانے لگا اور انہیں کالجوں اور سکولوں سے بہت سے پیشہ ور کھلاڑی اُبھرے ۔

کھیل شروع ہونے پر ہر کھلاڑی اپنی گیند ایک چوبی کھونٹے "ٹی" (Tee) پر رکھتا ہے اور اس کو حتی المقدور دور تک پھینکنے کی کوشش کرتا ہے ، لیکن اس بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے کہ گیند جس مقام پر گرے وہ جگہ صاف ہو ۔ اگر گیند ناہموار مقام پر پہنچ گئی جہاں جھاڑیاں وغیرہ ہوں تو پھر کھیلنے والے کو ایک سٹروک کا نقصان رہتا ہے ۔ کھلاڑیوں کے لیے مصنوعی رکاوٹوں سے بچنا ضروری ہوتا ہے ۔ سوراخ جن میں گیند ڈالنا ہوتی ہے ہموار گھاس کے میدان کے بیچ میں ہوتے ہیں اور ان کی کل تعداد 18 ہوتی ہے جن کا قطر 4½ انچ ہوتا ہے ۔ جس کھلاڑی نے کم سے کم سٹروک کی تعداد کے ساتھ ان سوراخوں میں گیند ڈالی ہو وہی جیت جاتا ہے ۔ "ٹی" سے گڑھے تک کا فاصلہ 100 اور 600 گز کے درمیان ہو سکتا ہے ۔ گاف کی ایک اور قسم "کلاک گاف" کہلاتی ہے ، جو کسی بھی میدان میں کھیلی جا سکتی ہے ۔

اُمّید کی کرن

محمد اقبال ثاقب

ڈاکٹر ثمینہ وارڈ میں اپنی کُرسی پر بیٹھی ہوئی تھیں کہ سامنے والے دروازے سے ایک باوقار بوڑھی عورت داخل ہوئی ۔ ڈاکٹر ثمینہ نے جب اُس عورت کو دیکھا تو اُس کا چہرہ کِھل اُٹھا اور وہ کُرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی ۔ یہ عورت ڈاکٹر ثمینہ کی ماں تھی جو اس سے ملنے آئی تھی ۔ ماں بھی اپنی بیٹی کو ڈیوٹی پر دیکھ کر بُہت خوش تھی ۔ ڈاکٹر ثمینہ نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اپنی امّی کو سر جُھکا کر السّلام و علیکم کہا ۔ ماں نے بھی و علیکم اسلام کہا اور پھر دونوں کُرسیوں پر بیٹھ گئیں اور باتیں کرنے لگیں ۔

وارڈ میں بیڈ پر لیٹی ہوئی آٹھ سالہ عذرا نے جب ڈاکٹر ثمینہ کو اپنی امّی کے ساتھ اس انداز سے مِلتے دیکھا تو نہ جانے کیوں اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔

ڈاکٹر ثمینہ کی امّی تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد واپس چلی گئیں ۔ اب وارڈ میں راؤنڈ کا وقت ہو چُکا تھا ۔ ڈاکٹر ثمینہ راؤنڈ کرتے ہوئے عذرا کے پاس آئی تو کیا دیکھتی ہے کہ ننّھی عذرا تکیے میں سر دے کر آہستہ آہستہ رو رہی ہے ۔ ڈاکٹر صاحبہ نے پوچھا ، "عذرا بیٹی ، کیا بات ہے ؟ کیوں رو رہی ہو ؟"

عذرا نے ڈاکٹر ثمینہ کی طرف دیکھا اور پھر رونے لگی ۔ ڈاکٹر نے عذرا کے سر پر ہاتھ رکھا اور دلاسا دیتے ہوئے کہا ۔ "بیٹی کیوں اُداس ہو گئی ہو ؟ فکر مت کرو انشاءاللہ بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی" ۔ مگر پتا نہیں عذرا کا ننّھا سا دِل کِس بات سے دُکھ گیا تھا کہ اُسے صبر ہی نہیں آ رہا تھا ۔ ڈاکٹر ثمینہ عذرا کے پاس بیٹھ گئی اور پوچھنے لگی "بیٹی ! بتاؤ کیا ہوا ہے ؟ کیوں رو رہی ہو ؟ تمہاری جو اُلجھن ہو گی ، میں دُور کر دوں گی ۔" ڈاکٹر صاحبہ کی شفقت کا عذرا پر کچھ اثر ہُوا اور اُس نے رونا بند کر دیا ۔

ڈاکٹر ثمینہ نے دوبارہ پوچھا "عذرا بیٹی اب بتاؤ تمہیں کِس وجہ سے رونا آ گیا تھا ؟

عذرا نے بتایا "جب میں نے ہوش سنبھالا تو دیکھا کہ دوسرے بچّوں کی طرح میرا باپ نہیں ہے ۔ امّی نے مجھے بتایا کہ تمہارا باپ تمہارے پیدا ہونے کے ایک سال بعد وفات پا گیا تھا ۔ میرا کوئی اور بھائی بہن نہیں تھا ۔ امّی سینے پرونے کا کام کر کے گھر کا خرچ چلاتی تھیں ۔ جب میری عمر تین سال کی ہوئی تو امّی نے مجھے اسکول میں داخل کروا دیا ۔ وہ دِن رات محنت کر کے گھر کے اخراجات کے ساتھ ساتھ میرے اسکول کے اخراجات بھی پورے کرتی تھیں ۔ جب میں پہلی دفعہ اپنی کلاس میں اوّل آئی تو امّی بہت خوش ہوئی اور میری اِس کامیابی پر مجھے خوب صورت نئے کپڑے بنوا کر دیئے ۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر اسی طرح محنت کرتی رہو گی تو میں تمہیں اعلیٰ تعلیم دلوا کر ڈاکٹر بناؤں گی ۔ امّی کی اِن باتوں سے مجھے بہت حوصلہ ہوا اور میں دِل لگا کر مزید محنت کرنے لگی ۔ میرے ذہن میں ایک ہی دُھن سمائی ہوئی تھی کہ میں ڈاکٹر بنوں گی ۔"

"مگر شاید خُدا کو کچھ اور ہی منظور تھا ۔ جب میں تیسری جماعت میں تھی تو امّی کی بینائی جواب دے گئی ۔ اب میرے اسکول کے

اخراجات تو کیا ، گھر کے اخراجات بھی پورے نہ ہوتے تھے ہم ماں بیٹی کا کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ امّی سخت پریشان تھیں ۔ انہوں نے اپنے تھوڑے بُہت زیورات بھی بیچ دیے تھے ۔ مجھ سے اپنی نابینا ماں کی یہ پریشانی دیکھی نہ گئی ۔ میں نے اُن سے کہا کہ اب میں اسکول نہیں جاؤں گی ۔ امّی نے پوچھا تو پھر تم کیا کرو گی ؟" میں نے کہا کہ محلّے کی کچھ لڑکیاں کوٹھیوں میں کام کرتی ہیں ۔ میں بھی کسی کوٹھی میں کام ڈھونڈ لوں گی ۔ امّی نے کہا "مگر بیٹی ، وہ تو تم سے بڑی ہیں ۔" میں نے کہا ۔ "کوئی بات نہیں میں کسی سے کم پیسے لے کر اُس کا کام کر دیا کروں گی ۔"

"امّی ایسا چاہتی تو نہیں تھیں ۔ مگر اِس کے سِوا کوئی اور چارا بھی نہ تھا ۔ اُنہوں نے اپنی ایک جاننے والی ہمسائی سے کہا کہ کسی کوٹھی میں میرے لیے کام تلاش کر دے ۔ چند ہی دِنوں میں اُس ہمسائی نے بتایا کہ ایک کوٹھی والوں کو ایک ملازمہ کی ضرورت ہے ۔ چنانچہ اگلے روز میں اُس ہمسائی کے ساتھ اُس کوٹھی میں چلی گئی ۔ اُنہوں نے مجھے تھوڑی سی تنخواہ پر رکھ لیا ۔

"اب میں ہر روز صبح سویرے محلّے کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ کام پر چلی جاتی اور شام کو واپس آ جاتی اسی طرح کام کرتے دو ماہ گزر گئے ۔ ایک شام میں سارا دن تھک ہار کر بستر پر لیٹی ہوئی تھی ۔ میری نابینا ماں میری پاس بیٹھ گئیں ۔ اتفاقاً اُن کا ہاتھ میرے ہاتھ پر لگ گیا ۔ کہنے لگیں ! "ارے عذرا ! یہ تمہارا ہاتھ ہے ؟" میں نے جواب دیا "ہاں ، امّی یہ میرا ہی ہاتھ ہے ۔"

"کتنا موٹا اور کُھردرا ہے ۔ کوٹھی والے اِس قدر زیادہ کام لیتے ہیں تم سے ؟" میں کچھ نہ بولی ۔ امّی میرے ہاتھ کو پکڑ کر رونے لگیں ۔ میرے بھی آنسو نِکل آئے ۔ مگر میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور امّی سے کہا "کوئی بات نہیں ، کام تو کرنا ہی پڑتا ہے ۔ اِس میں پریشانی کی کیا بات ہے ؟" امّی نے روتے ہوئے کہا ۔ "بیٹی ، تمہاری یہ عمر ایسا کام کرنے کی نہیں ہے ۔

میں نے کہا ۔ "آپ مجھے حوصلہ دیں تاکہ میں کام کر سکوں ۔ اِس طرح تو مُجھ سے کچھ بھی نہیں ہو سکے گا ۔" انہوں نے شفقت سے میرے ہاتھ کو چُوما اور دُعا دی ۔

"ڈاکٹر صاحبہ کام کا یہ سلسلہ کوئی ایک سال تک جاری رہا ۔ میری وجہ سے امّی کی پریشانی نے انہیں بیمار کر دیا ۔ میں نے کوٹھی والوں سے ایڈوانس پیسے لے کر اُن کا علاج کروایا ۔ مگر وہ روز بروز کمزور ہوتی گئیں اور پچھلے سال مجھے اِس دُنیا میں بالکل تنہا چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئیں ۔ امّی کی وفات کے بعد کوٹھی والوں نے مجھے اپنی کوٹھی میں رہنے کی اجازت دے دی ۔ اب میں دن بھر کام کرتی تھی اور رات کو وہیں سو جاتی تھی ۔

"پچھلے ہفتے جب میں سبزی لینے جارہی تھی تو مجھے ایک موٹر سائیکل نے ٹکر مار دی اور میرا بازو ٹوٹ گیا ۔ میرے مالکوں نے مجھے اِس ہسپتال میں داخل کروادیا ۔ وہ صُبح شام مجھے کھانا بھیج دیتے ہیں ۔

" مگر بیٹی ، پہلے تو تم کبھی نہیں روئیں ۔ آج کیا خاص بات ہوئی ؟" ڈاکٹر ثمینہ نے پوچھا ۔

"ڈاکٹر صاحبہ ، دراصل آج جب آپ کی امّی آپ سے مِلنے آئیں تو مُجھے اپنی امّی یاد آ گئیں ۔ کاش ! امّی کی خواہش کے مطابق میں ڈاکٹر بن جاتی ۔ وہ مجھے ڈیوٹی پر دیکھتیں تو کِتنا خوش ہوتیں ۔

ننھی عذرا کا یہ جواب سُن کر ڈاکٹر ثمینہ کی آنکھیں چھلک اُٹھیں ۔ انہوں نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا "عذرا بیٹی ، تم اب بھی ڈاکٹر بن سکتی ہو ۔" اُن کی یہ بات سُن کر عذرا کی گول گول معصوم آنکھیں چمک اُٹھیں ۔ اُس نے پوچھا "مگر ڈاکٹر صاحبہ ، اب میں کیسے ڈاکٹر بن سکتی ہوں ؟"

ڈاکٹر ثمینہ نے جواب دیا "بیٹی ہمارے معاشرے میں صِرف ایسے ہی افراد نہیں ہیں جو لوگوں کی مجبوریوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں ۔ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو مجبور لوگوں کی خدمت کرتے اور اُن کو معاشرے کا باوقار شہری بناتے ہیں" ۔ ڈاکٹر صاحبہ نے عذرا سے وعدہ کیا کہ جب تم ٹھیک ہو جاؤ گی تو میں تمہیں "ایس ۔ او ۔ ایس چلڈرن ولیج" میں داخل کروادوں گی اور تم انشاء اللہ ضرور ڈاکٹر بن جاؤ گی ۔

ڈاکٹر ثمینہ کی یہ باتیں سُن کر عذرا کو اُمید کی ایک اور کرن نظر آ گئی !

مُنّے میاں لیٹر بکس میں خط ڈالنے جا رہے
ہیں ۔ لیکن سڑک پر بارش کی وجہ سے
جگہ جگہ جوہڑ (تالاب) بن گئے ہیں ۔
بتائیے ، وہ کون سا (سفید) راستہ اختیار
کریں کہ جوہڑوں سے بچتے ہوئے لیٹر
بکس تک پہنچ جائیں؟
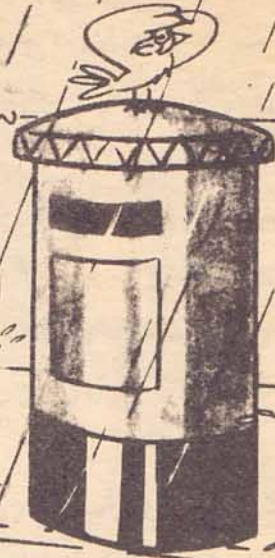
مئی 1989 کے کارٹون کے بے شمار عنوان موصول ہوئے ، جن میں سے ججوں کو صرف ایک عنوان "نیم حکیم خطرۂ جان" پسند آیا ۔ جن بچّوں نے یہ عنوان تجویز کیا ، ان کے نام درجِ ذیل ہیں۔

شکیل احمد ، واہ کینٹ ۔ کشور حسین ، سیت پور ضلع مظفر گڑھ ۔ محمد منظر رضا ، سیت پور ۔ محمد عرفان انور ، چک 299گ ۔ ب ضلع ٹوبہ ٹیک سنگھ ۔ رشید احمد ، اسلام پارک لاہور ۔ طلال احمد ، بہاول پور ۔ محمد رضوان ظہور ، پیپلز کالونی فیصل آباد ۔ سعید رمضان ، جھنگ ۔ راشدہ انجم ، ممتاز آباد ملتان ۔ سبین علی خان ، ڈیرہ غازی خان ۔ محمد فرحان ، قدیر آباد ملتان ۔ محمد علی ، کشمیر روڈ راولپنڈی ۔ محمد اسعد حنیف ، ٹنچ بھاٹیہ راولپنڈی ۔ سیّد حسن رضا زیدی ، اسلام آباد ۔ سیّد حماد رضا ، اسلام آباد ۔ محمد نعمان ، سرگودھا ۔ احمد فیضان بابر ، پیپلز کالونی فیصل آباد ۔ خرم بلال ، چوک بازار ملتان ۔ صادق علی ، سرفراز کالونی فیصل آباد ۔ محمد نواز بنگش ، ٹل شہر ضلع کوہاٹ ۔ وقار احمد انصاری ، بہاولپور ۔ شہلا ناہید ، رتہ امراں راولپنڈی ۔ عامر سعید ، چمن زار راولپنڈی ۔ قُرۃ العین آصف ، باغ بان پورہ لاہور ۔ سیّد علی عدنان حیدر نقوی ، سمن آباد لاہور ۔ مصباح غفار ، گلشنِ راوی لاہور ۔

یومِ ٹیپو 1989ء
بچّوں کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش

تعلیم و تربیت میں ٹیپو سُلطان کے سلسلہ وار کامک کے اختتام پر ادارۂ تعلیم و تربیت نے الحمرا آرٹ کونسل کے تعاون سے 4 مئی 1989ء کو ٹیپو شہید پر بچّوں کی بنائی ہوئی پینٹنگز کی نمائش کا اہتمام کیا جس میں پورے مُلک کے بچّوں نے حصّہ لیا اور ساڑھے پانچ سو سے زائد پینٹنگز نمائش کے لیے ارسال کیں ۔ نمائش 4 مئی سے 11 مئی تک جاری رہی ۔

4 مئی کو نمائش کے افتتاح سے پہلے الحمرا آرٹ کونسل کے ہال نمبر 2 میں ایک تعارفی تقریب منعقد ہوئی ۔ جس میں مختلف سکولوں کے سینکڑوں بچّوں نے شرکت کی ۔ پروفیسر مسز عباسی عابدی ، پرنسپل نیشنل کالج آف آرٹس لاہور مہمانِ خصوصی تھیں ۔

تقریب کا آغاز اللہ کے پاک نام سے کیا گیا ۔ تلاوتِ کلامِ پاک کے بعد ریٹائرڈ میجر ابراہیم میر صاحب نے بچّوں سے خطاب کیا ۔ انہوں نے ٹیپو شہید کے بچپن پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ٹیپو ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اور اُن کی پرورش اسلامی ماحول میں ہوئی تھی ۔ یہ اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے دُنیا کے سب سے بڑے سامراج سے ٹکّر لی اور اپنے خُون سے پاکستان کی بنیاد رکھی ۔ انہوں نے بچّوں سے کہا کہ آپ کو ٹیپو شہید کی طرح اسلام کا مجاہد بننا چاہئے ۔ میر ابراہیم صاحب نے آخر میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ ٹیپو شہید کی برسی ہر سال سرکاری سطح پر منائی جانی چاہئے ۔ میر صاحب کے خطاب کے بعد جناب ڈاکٹر عبدالرؤف نے بچّوں سے خطاب کیا ۔ انہوں نے کہا تاریخی موضوعات پر کامک سیریز کا سہرا صرف تعلیم و تربیت کے سر ہے ۔ انہوں نے حاضرین کو بتایا کہ اس کامک کی روحِ رواں جناب محمود حسن رُومی ہیں جن کے رنگوں نے تصویروں میں جان ڈال دی ہے ۔

تقریب کے آخر میں مہمانِ خصوصی محترمہ پروفیسر مسز عباسی عابدی نے بچّوں کی پینٹنگز کی تعریف کی اور کہا کہ پینٹنگز سے بچّوں کے ذہن کے دروازے کھُلتے ہیں ۔ انہوں نے حاضرین کو بتایا کہ ہم کوشش کر رہے ہیں کہ فنِ مصوّری کو اسکولوں کے نصاب میں شامل کر دیا جائے ۔ انہوں نے منصفین کے فیصلے کی تعریف کی اور کہا کہ انہوں نے بڑی احتیاط سے صحیح حقداروں کو انعامات دیئے ہیں ۔

مہمانِ خصوصی کے خطاب کے بعد بچّوں میں انعامات تقسیم کیے گئے ۔ انعامات کا فیصلہ مندرجہ ذیل جج صاحبان نے کیا تھا:

۱ ۔ پروفیسر سعید اختر ، نیشنل کالج آف آرٹس لاہور ۔
۲ ۔ مسز نصرت علی ، مینجر پینٹنگز لاہور میوزیم ۔
۳ ۔ مسٹر اقبال احمد ، لیکچرار پنجاب یونیورسٹی فائن آرٹس ڈیپارٹمنٹ ۔
۴ ۔ مسٹر محمد ظہیر الحق ، اسسٹنٹ آرٹ ڈائریکٹر ، پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ ، لاہور ۔
۵ ۔ مسٹر ریاض بھٹی ، انچارج شاکر علی میوزیم لاہور ۔
۶ ۔ مسٹر عبدالسلیم ، آرٹ ڈائریکٹر بیلنس پبلسٹی لاہور ۔

جج صاحبان کے فیصلے کے مطابق مندرجہ ذیل بچّوں کو انعام دیئے گئے:

پہلا انعام: وقار احمد ، نخشی پشاور ۔
دوسرا انعام: آمنہ جاوید ، ڈویژنل پبلک سکول ماڈل ٹاؤن لاہور ۔
تیسرا انعام: سہیب رشید ، کریسنٹ ماڈل سکول لاہور ۔

ان کے علاوہ مندرجہ ذیل بچّوں کو خصوصی انعامات دئے گئے ۔

قادر داد ، ناروے ۔ میریم الطاف ، ڈویژنل پبلک اسکول لاہور ۔ ماریہ جاوید ، ڈویژنل پبلک اسکول لاہور ۔ عمیر سلیم ، راولپنڈی ۔ فراز احمد خان ، گلبرگ لاہور ۔ محمد ایاز ، کوہاٹ ۔ ژوبیہ کھوکھر ، راولپنڈی ۔ عدیلہ ثناءاللہ ، اقبال ٹاؤن لاہور ۔

اس کے علاوہ منصفین نے دو خصوصی انعامات ، ایس ۔ او ۔ ایس چلڈرن ویلیج لاہور اور شالیمار سپیشل ایجوکیشن سنٹر لاہور کو بھی دئیے ۔

انعامات تقسیم کرنے کے بعد مہمانِ خصوصی محترمہ مسز عباسی عابدی نے نمائش کا افتتاح کیا ۔ جسے سب بچّوں نے بڑی دلچسپی سے دیکھا ۔

امینہ جاوید، لاہور — دوسرا انعام

مریم الطاف لاہور — خصوصی انعام

فراز احمد خان — خصوصی انعام

وقار احمد، پشاور — پہلا انعام

ماریہ جاوید، لاہور — خصوصی انعام

عدیلہ ثناء اللہ، لاہور — خصوصی انعام

محمد ایاز، کوہاٹ — خصوصی انعام

قادر داد، ناروے — خصوصی انعام

زوبیہ کھوکھر، راولپنڈی — خصوصی انعام

سہیب رشید، لاہور — تیسرا انعام

عمر سلیم، راولپنڈی — خصوصی انعام

لوگ جو اس دُنیا میں رہتے ہیں

محمد صابر اختر

اگر آپ افریقہ، چین، گرین لینڈ یا دُنیا کے کسی دوسرے حصے میں جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقے ہم سے بہت مختلف ہیں۔ **اُن کے گھر، لباس اور خوراک ہمارے جیسے نہیں، اور نہ اُن کی فصلیں اور جانور ویسے ہیں جیسے ہمارے ہاں پائے جاتے ہیں۔**

دراصل لوگوں کے رہنے سہنے کا انحصار اُس جگہ کی آب و ہوا پر ہوتا ہے جہاں وہ رہتے ہیں۔ گرم آب و ہوا میں ہمیں ٹھنڈے گھروں اور باریک لباس کی ضرورت ہوتی ہے اور سرد آب و ہوا میں گرم گھروں اور گرم کپڑوں کی۔

سرد مقامات کے لوگ: قطب شمالی دُنیا کا سب سے ٹھنڈا حصہ ہے۔ یہاں ہمیشہ برف جمی رہتی ہے۔ اِس لیے یہاں درخت نہیں اُگتے۔ صرف گرمیوں میں اُونچے مقامات پر جب برف پگھلتی ہے تو تھوڑے بہت پودے اُگ آتے ہیں۔ یہاں پر گرمیوں کا موسم بہت مختصر ہوتا ہے۔ مگر گرمیوں کے وسط میں سُورج مکمّل طور پر غُروب نہیں ہوتا بلکہ رات کو بھی چمکتا ہے۔ اُس علاقے میں سردیاں لمبی و تاریک ہوتی ہیں۔ یہاں رہنے والے لوگوں کو "اسکیمو" کہا جاتا ہے۔ چوں کہ شدید سردی کی وجہ سے یہاں سبزیاں وغیرہ کاشت نہیں کی جاسکتیں، اِس لیے اسکیمو لوگ برفانی ریچھ اور مچھلی کا گوشت کھاتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر لوگ خانہ بدوش ہیں اور خوراک کی تلاش میں ادھر اُدھر گھومتے رہتے ہیں۔

قطب شمالی کے علاوہ کئی گرم ملکوں کے سطح سمندر سے بلند مقامات بھی کافی سرد ہوتے ہیں جس طرح ہمارے مُلک میں مری کا علاقہ ہے جہاں سردیوں کے موسم میں کافی برف پڑتی ہے اور اونچے اونچے پہاڑ برف سے ڈھک جاتے ہیں۔ تبّت دُنیا کا بلند ترین مُلک ہے جو اُونچے اونچے پہاڑوں سے گِھرا ہوا ہے۔ یہاں بھی برف باری ہونے کی وجہ سے فصلیں کاشت نہیں کی جاسکتیں۔ اِس لیے یہاں کے زیادہ تر لوگ بھی خانہ بدوش ہیں جو اپنے جانوروں کے گلّوں کو لے کر گھومتے رہتے ہیں اور گھاس تلاش کرتے ہیں۔ تبّت کے لوگ خیموں میں رہتے ہیں جو "یاک" (تبّتی بیل) کے بالوں سے بنائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ یاک کے دودھ سے مکھن نکالتے ہیں جسے وہ بطورِ غذا استعمال کرتے ہیں اور چائے میں بھی ڈالتے ہیں۔

منگولیا کا کچھ حصّہ رُوس میں ہے اور کچھ حصّہ چین میں۔ یہاں پہاڑی علاقے کے علاوہ بہت سا ہموار رقبہ بھی ہے جو گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں ٹھنڈا ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ بھی زیادہ تر خانہ بدوش ہیں اور خوراک کی تلاش میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔

معتدل آب و ہوا کے لوگ: مُعتدل آب و ہوا کے علاقے نہ تو گرمیوں میں بہت زیادہ گرم ہوتے ہیں اور نہ سردیوں میں بہت زیادہ سرد۔ عام طور پر یہاں بارشیں زیادہ ہوتی ہیں۔ یورپ کے نصف مغربی حصّے کی آب و ہوا معتدل ہے۔ اس حصّے میں آباد ممالک کے باشندے تقریباً ایک ہی طرح کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

امریکا اور کینیڈا کے شمالی اور جنوبی حصّوں کے علاوہ باقی تمام حصّوں کی آب و ہوا مُعتدل ہے۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر شہروں اور قصبوں میں رہتے ہیں۔ دیہات بہت کم ہیں لیکن کاشتکاری یہاں کا اہم پیشہ ہے۔ یہاں کی زمین بہت زرخیز ہے جس میں بہت سی فصلیں اُگائی جاتی ہیں۔

نیوزی لینڈ بھی معتدل آب و ہوا کا مُلک ہے۔ یہاں کی آب و ہوا گائیں اور بھیڑیں پالنے کے لیے بہت مفید ہے۔ یہاں عام طور پر لکڑی کے مکان بنائے جاتے ہیں۔ زلزلہ آنے کی صورت میں ایسے گھر بہت مفید ثابت ہوتے ہیں۔

چین اور جاپان ایشیا کے دو اہم مُلک ہیں۔ جاپان کے لوگ بڑے بڑے شہروں میں رہتے ہیں اور فیکٹریوں میں کام کرتے ہیں۔ چین کے زیادہ تر لوگ دیہات میں رہتے ہیں اور کھیتی باڑی کرتے ہیں۔

ہمارے وطن پاکستان کی آب و ہوا بھی زیادہ تر معتدل ہے۔ ہمارے ہاں بھی زیادہ تر آبادی دیہات میں آباد ہے اور کھیتی باڑی کرتی ہے۔

گرم ممالک کے لوگ: گرم ممالک کے باشندوں کی جِلد عام طور پر سیاہ ہوتی ہے۔ کیوں کہ سیاہ جلد پر سورج کی تیز شُعاعیں کم اثر کرتی ہیں۔ اِن ممالک کے کچھ لوگ خانہ بدوش ہوتے ہیں اور خوراک کی تلاش میں ایک جگہ سے دوسری جگہ حرکت کرتے رہتے ہیں۔

عرب ممالک میں گرم اور خُشک صحرا ہیں۔ یہ صحرا تیل کی دولت سے مالامال ہیں اور یہاں کے لوگ تیل کے کنوؤں کے ارد گرد قصبے آباد کر لیتے ہیں۔ عرب لوگ لمبے لمبے لباس پہنتے ہیں اور سر کو سورج کی گرمی سے بچانے کے لئے کپڑے سے ڈھانپتے ہیں۔ یہاں بوجھ ڈھونے کے لیے اُونٹ ایک اہم جانور ہے۔ اِسی لئے اونٹ کو ”صحرا کا جہاز“ کہا جاتا ہے۔ یہاں کے لوگ اُونٹ کے بالوں سے اپنے خیمے بناتے ہیں اور کھال سے پانی کے مشکیزے۔

افریقی صحراؤں کے باشندے جنگلی لوگ ہیں۔ یہ لوگ تیروں سے جانورں کا شکار کرتے، سانپ اور چھپکلیاں کھا جاتے اور انڈوں کے خول کو پانی پینے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ یہ اپنے چوپائے ساتھ لے کر گھاس کی تلاش میں پھرتے رہتے ہیں اور جہاں گھاس مِل جائے وہیں ڈیرے ڈال دیتے ہیں۔ یہ عموماً رات کو سفر کرتے ہیں تاکہ گرمی کی شِدّت سے بچے رہیں۔

امریکی ریڈ انڈین پہلے پورے امریکا میں پھیلے ہوئے تھے۔ لیکن یورپ کے سفید فام لوگوں نے اِن لوگوں کو آہستہ آہستہ امریکا کے گرم علاقوں میں دھکیل دیا۔ یہ لوگ غلّہ اُگاتے اور جانور پالتے ہیں۔

گرم مرطوب آب و ہوا کے لوگ: افریقہ کے گرم مرطوب جنگلوں میں رہنے والے باشندوں کو ”پگمی“ (بونے) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ تیروں سے جانوروں کا شکار کرتے اور جنگلی درختوں کی جڑیں اور پھل بطورِ غذا استعمال کرتے ہیں۔ شہد بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہ گھومتے پھرتے رہتے ہیں اور جنگلوں میں درختوں کی ٹہنیوں سے جھونپڑیاں بنا کر رہتے ہیں۔

بنگال کے علاقے کی آب و ہوا بھی گرم مرطوب ہے۔ یہاں بارشیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ بنگالی لوگ بانس اور کھجور کے پتوں سے جھونپڑیاں بناتے اور چاول، مچھلی کھاتے ہیں۔ آدمی دھوتی پہنتے ہیں اور عورتیں ساڑھی پہنتی ہیں۔

”بورو“ بھی جنگلی لوگ ہیں جو جنوبی امریکا کے گرم مرطوب علاقوں میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ صرف لنگوٹی باندھتے ہیں اور لکڑی کے زیورات بناتے اور پہنتے ہیں۔ شکار بھی کھیلتے ہیں اور فصلیں بھی اُگاتے ہیں۔

ملایا بھی ایک گرم مرطوب مُلک ہے یہاں ربڑ کے درخت اُگائے جاتے ہیں اور اُن کے دودھ سے ربڑ بنایا جاتا ہے۔

پُراسرار نقاب پوش اور عنبر ماریا کی زبردست کامیابی کے ساتھ ساتھ بچّوں کے پسندیدہ مصنّف
اے حمید کی ایک انوکھی پُراسرار تاریخی اور حیرت انگیز سیریز
انگوٹھی کہاں گئی؟
اندھیری سُرنگ میں سِسکیوں کی آواز کِس کی تھی؟
چراغ ہاتھ میں لیے تاریک مقبرے کی سیڑھیاں اُترنے والا کون تھا؟
اِسلام کے بہادر جرنیل محمّد بن قاسم نے ہندوستان میں اسلام کا پرچم لہرایا۔
جنگِ آزادی کے ہیرو بخت خان نے اسلام کی سربلندی کے لیے جدوجہد کی۔
سُلطان ٹیپو نے اپنی شہادت کے ساتھ اِسلام کا پرچم قائدِ اعظمؒ کے سپُرد کیا اور قائدِ اعظمؒ نے اِسلام کے نام پر ہمارے لیے پاکستان بنایا۔
محمّد بن قاسم سے لے کر قائدِ اعظم تک کے صدیوں کے سفر کی سچّی اور ولولہ انگیز داستان۔
بُت پرستوں کے رونگٹے کھڑے کر دینے والے آسیب۔
کافر جادُوگروں کی مُسلمانوں کے خلاف خُونی سازشیں۔
بُت پرست کاہن جس کے مُنہ سے سانپ نِکل کر دوسرے کے مُنہ میں چلا جاتا تھا۔
مگر فاران نے اللہ کی دی ہوئی طاقت سے ان تمام کافر جادُوگروں اور بُتوں کی پُوجا کرنے والوں کو شکستِ فاش دی۔
ماہ جولائی سے اِس دلچسپ، حیرت انگیز اور سنسنی خیز سیریز کی پہلی قِسط پڑھنا نہ بھولیں۔

آپ کا خط ملا

● سالنامے کا سرورق لاجواب تھا۔ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اندر سے بھی رسالہ اتنا ہی اچھا تھا جتنا کہ باہر سے۔ تمام ادیبوں کی کہانیاں بہت دِل چسپ تھیں۔ انعامی سلسلے اچھے ہیں کیونکہ اِن سے بچّوں کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔ (تابندہ صالح، پیر محل)

● صُبح کا وقت تھا جب امّی جان نے مجھے بتایا کہ تعلیم و تربیت کا سالنامہ آگیا ہے۔ سب بہن بھائیوں نے رسالہ ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بہت مزیدار تھا۔ سرورق تو اتنا خوبصورت تھا کہ بیان نہیں کر سکتی ہماری ننھی منّی دُعائیں ہر دم اس رسالے کے ساتھ ہیں۔
(رابعہ رؤف، سیالکوٹ)

● سالنامہ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ ٹائٹل بے حد پسند آیا۔ پُر اسرار پرندہ، ایک وصیّت، کِرن اور ٹکڑوں کوں کہانیاں بہت اچھی تھیں۔ لطائف بھی اچھے تھے۔ (رابعہ محمد نذیر، جیکب لائنز، کراچی)

● مئی کا شمارہ پڑھ کر دِلی مسرت ہوئی۔ پُر اسرار نقاب پوش اچھیّ سیریل ہے۔ ندامت، مغرور شہزادہ، پُر اسرار پرندہ بُہت اچھی کہانیاں تھیں۔ لطائف بھی اچھے تھے۔ روشنی کا سفر پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ (رؤف احمد گورایہ، پاک پتن)

● سالنامہ کے بارے میں جیسا سُنا تھا اُس سے بڑھ کر پایا۔ سرورق بُہت ہی حسین تھا۔ کہانیوں میں پہچان، عید کی سچّی خُوشی، چاند ہوٹل، اُلّو کا مُقدمہ اور نرالا فیصلہ، بھوتوں کا جنگل، ندامت، پُر اسرار پرندہ، ایک وصیّت، اور کِرن پسند آئیں۔ پُر اسرار نقاب پوش سُپر ہٹ جا رہی ہے۔ لطائف بھی اچھے تھے۔ (محمد احمد گوہیر، اِسلام آباد)

● میں نے بچّوں کے تمام رسالے پڑھے ہیں لیکن تعلیم و تربیت کا جواب ہی نہیں۔ مئی کا سالنامہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی۔ مغرُور شہزادہ عید کی سچّی خوشی، چاند ہوٹل اور پر اسرار نقاب پوش کہانیاں پسند آئیں۔ (عبدالفیصل، اچھرہ لاہور)

● مئی کا شمارہ دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ سرورق تو بہت ہی خوبصورت تھا۔ اے حمید کی کہانی بہت اچھّی جا رہی ہے۔ اس کے علاوہ ندامت اور کرن کہانیاں بہت پسند آئیں۔ لطیفے بھی نئے اور اچھے تھے۔ (صدف نُور، بہاولپور)

● سالنامہ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ سب کہانیاں اچھّی تھیں۔ ٹائیٹل بھی بہت پسند آیا۔ آپ نے "آپ بھی پوچھیے" سالنامہ میں بھی نہیں دیا کیا وجہ ہے؟ کیا آپکو سوالوں کے جواب نہیں آتے؟
(سجّاد احمد، میاں چنُوں)

● آج تک میں نے جتنے بچّوں کے رسالے پڑھے ہیں، ان میں سب سے بہتر تعلیم و تربیت کو پایا۔ سالنامے میں تیراکی اور قدیم انسان کے بارے میں اچھّی اچھّی معلومات حاصل ہوئیں۔ اس کے علاوہ ہیبت ناک گوریلا، اندھیری رات کا کھنڈر اور قبرستان کا سانپ بھی اچھّی کہانیاں تھیں۔ (وقار احمد انصاری، بہاول پُور)

● میں نے اور بھی بچّوں کے رسالے پڑھے ہیں لیکن ان سب رسالوں میں سب سے زیادہ مجھے تعلیم و تربیت پسند ہے۔ سالنامہ میں مجھے جو کہانیاں پسند آئیں وہ پُر اسرار نقاب پوش، چاند ہوٹل، چاند کا سفر، خوبصورت پھول، پہچان، بھوتوں کا جنگل، مغرور شہزادہ، عید کی سچی خوشی ہیں۔ لطیفے بھی اچھّے تھے۔ (نفیس رضا میرانی، گڈو)

● سالنامے کی تعریف کے لئے الفاظ نہیں مِل رہے۔ ٹائٹل بہت اچھّا تھا۔ "عید کی سچّی خوشی" اور "ندامت" بہت اچھّی کہانیاں تھیں اِس کے علاوہ "خوبصورت پھول" اور "پہچان" بھی کافی معیاری تھیں۔ پُر اسرار نقاب پوش اِس بار بھی نمبر لے گیا۔
(محمّد امین، والٹن روڈ لاہور چھاؤنی)

● تعلیم و تربیت کا سالنامہ ہمارے خیال سے کہیں بڑھ کر اور تصوُّر سے کہیں زیادہ خُوب صورت تھا۔ بے حد پسند آیا۔ پہچان، چاند ہوٹل، ایک وصیّت اور چاند کا سفر بہترین کہانیاں تھیں۔ ٹکڑوں کوں (لطیفہ) بہت مزیدار تھا۔
یہ جان کر بڑی مسرت ہوئی کہ اگلے ماہ سے تیسرا سلسلہ وار کامک "شیر شاہ سُوری" شروع ہو رہا ہے۔ (مختار علی، چیمبرلین روڈ لاہور)

● میں کوئی ایک سال سے تعلیم و تربیت پڑھ رہی ہوں۔ مگر خط پہلی بار لکھا ہے۔ مجھے تعلیم و تربیت بُہت پسند ہے اس کے سالنامے کا بُہت دنوں سے انتظار تھا۔ روز بازار جاتی تھی۔ کل رات بازار گئی تو سامنے تعلیم تربیت نظر آیا۔ فوراً خرید لیا اور فوراً پڑھ بھی لیا۔ سارا رسالہ بُہت اچھا تھا۔ (سعدیہ سیّد)

● سالنامہ عُمدہ تحریروں، دلکش ٹائٹل، خُوشنما تصاویر، بہترین سرِورق کے ساتھ مِلا۔ بہت پسند آیا۔ میری طرف سے اتنا اعلیٰ سالنامہ نکالنے پر مبارک باد قبول کیجیے۔ تمام تحریریں بہت اعلیٰ تھیں اُمید ہے کہ آئندہ بھی آپ ایسے ہی سالنامے نکالیں گے۔
(محمد ذیشان بن نذیر راجپوت، فیصل آباد)

● میں نے بچّوں کے بُہت رسالے پڑھے ہیں مگر تعلیم و تربیت کا جواب ہی نہیں۔ چاند ہوٹل اور مغرور شہزادہ کہانیاں بُہت پسند آئیں۔ اللہ تعالیٰ اِس رسالے کو دن دُگنی رات چگنی ترقی عطا فرمائے۔ (قمر عباس آف پنتو)

● ٹائیٹل کو مزید بہتر بنایا جائے، لطائف بھی اکثر پُرانے ہوتے ہیں۔ "ہونہار مصور" کے سلسلے کو بہت سارے بچّوں نے پسند کیا ہے لیکن آپ ایسے موضوع دیں جو چھوٹے بچّے بھی بنا سکیں۔ "پُر اسرار نقاب پوش" الف لیلوی کہانی معلوم ہوتی ہے۔
(سمیرا الطاف، خانیوال)

● مئی کا تعلیم و تربیت اپنی تمام تر خُوب صُورتیوں کے ہمراہ جلوہ افروز ہوا۔ تمام کہانیاں بہترین تھیں۔ پُراسرار نقاب پوش بہترین ناول ہے داؤدی علمی معمّا سے تو جان چھوٹ گئی۔ آئندہ کوئی ایسا مقابلہ شروع کرنے کی غلطی مت کیجئے گا۔ (محمّد عاقل احمد خان، پُرانا سکھر)

● سرورق اتنا خوبصورت تھا کہ دیکھتا ہی رہ گیا۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ پہچان، ہیبت ناک گوریلا اور پُر اسرار نقاب پوش خاص کر پسند آئیں۔ یہ سُن کر خوشی ہوئی کہ اگلے ماہ نیا کامک شروع ہو رہا ہے۔ امید ہے کہ یہ بھی پچھلے کامکوں کی طرح اچھا اور دلچسپ ہو گا۔ داؤدی علمی آزمائش معّمے سے تو اچھی ہے مگر کافی مشکل ہے۔ اس کو آسان بنایا جائے۔ (نعیم افضل، اسلام آباد)

● مئی کا چمکتا دمکتا سال نامہ بہت پسند آیا۔ سرورق بہت خوبصورت تھا۔ اس مرتبہ مجھے اے حمید صاحب کی پراسرار نقاب پوش بہت اچھی لگی اس کے علاوہ چاند ہوٹل، عید کی سچّی خوشی، خوبصورت پھول وغیرہ بھی پسند آئیں۔
(سیدہ النصر زہرا شیرازی، بہاول پور)

● چاند جیسا سالنامہ دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ کہانیوں میں مغرور شہزادہ، پُر اسرار پرندہ، جادُو کے کھیل اور کرن پسند آئیں میری دعا ہے کہ تعلیم و تربیت اور بھی اچھا ہو۔ (عُمر ریاض کاکشال پشاور)

● سالنامہ پڑھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔ ہر ادیب کی کہانی اچھی لگی۔ مگر ہماری پیاری ادیبہ صائمہ کی کہانی نہ دیکھ کر بہت دُکھ ہوا۔
(عامر صدیق، لاہور)

● سالنامہ 2 تاریخ کو مِلا۔ سرورق بس اچھا ہی تھا۔ لیکن کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں۔ خاص طور پر پُراسرار نقاب پوش۔ ہم سب گھر والوں کو ہر مہینے اس رسالے کا بہت بے تابی سے انتظار رہتا ہے۔
(نشو نورین، پشاور)

● ایسا اچھا سالنامہ نکالنے پر میری طرف سے مبارک باد قبول کریں مغرُور شہزادہ، سلسلے وار ناول نقاب پوش اور پہچان بہترین کہانیاں تھیں۔ (راجا سعید افضل، جہلم)

● تعلیم و تربیت میرا اور میرے گھر والوں کا پسندیدہ رسالہ ہے۔ اِسے ہم سب شوق سے پڑھتے ہیں۔ مئی کا خوبصورت سالنامہ پڑھا۔ دِل خوش ہوگیا۔ رنگ برنگی کہانیاں اور گرما گرم لطیفے بہت ہی مزے دار تھے۔ پُراسرار نقاب پوش سیریل بہت اچھا جارہا ہے۔
(جاوید شبیر، علی پور ضلع مظفر گڑھ)

● تمام کہانیاں بہت دلچسپ تھیں۔ خاص طور پر خوبصورت پُھول پہچان، ندامت، ایک وصیّت، چاند کا سفر اور کرن بہت پسند آئیں۔ پُراسرار نقاب پوش کی بات ہی اور ہے۔ ہونہار ادیب میں "گھوڑے کا فیصلہ" نقل شدہ ہے۔ (سائرہ بانو، اسلام آباد)

● سالنامہ معیاری تھا۔ "ندامت" اور "پُراسرار نقاب پوش" پڑھ کر بے حد مزہ آیا۔ لیکن علمی آزمائش پسند نہیں آئی۔ ہر مہینے کسی خاص موضوع پر سوالات پوچھے جائیں۔ مثلاً ایک ماہ سائنس، اگلے ماہ کھیل کے پھر ادب کے۔
لطائف کو زیادہ اہمیت دی جائے اور انعامی لطیفہ بھی منتخب کیا جائے۔
حافظ تنزیل الرحمٰن، ٹمبر مارکیٹ لاہور

● ہمارا وطن سلسلے میں صرف پاکستان کے شہروں کے بارے میں معلومات شائع کی جاتی ہیں اب بیرُونی ممالک کے شہروں مثلاً ماسکو، لندن، پیرس کے بارے میں بھی مضامین شائع کیے جائیں۔
(علی شان، لاہور)

● مئی کا سالنامہ پڑھا دل باغ باغ ہو گیا۔ اس دفعہ ٹائٹل بہت پسند آیا۔ اللہ تعالےٰ تعلیم و تربیت کو دِن دُوگنی رات چوگنی ترقّی عطا فرمائے، آمین (محمد وجاہت رضا شہانی، بھکّر)

نشان

محمد یونس حسرت

میں پانچ یا شاید چھ سال کا تھا جب ابُو نے مجھے پہلی مرتبہ کبوتروں کا گھونسلا دکھایا۔ ہمارا مکان دو منزلہ تھا اور اس مکان کی دوسری منزل کے ایک کمرے کی چھت کے قریب دیوار میں ایک اُکھڑی ہوئی اینٹ کی خالی جگہ میں کبوتروں نے اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا۔

"کچھ سنائی دیتا ہے؟" ابُو نے مجھ سے پُوچھا۔

میں نے سُننے کی کوشش کی۔ پہلے تو مجھے کچھ سنائی نہ دیا۔ مگر جب میرا پھولا ہوا سانس دُرست ہوا تو ایک مدّھم مدّھم آواز سُنائی دی "غُٹر غُوں! غُٹر غُوں!"

"دو بچے ہیں اِس گھونسلے میں" ابُو نی یوں جوش سے کہا جیسے انہوں نے کوئی حیرت انگیز بات معلوم کرلی ہے۔ پھر وہ کہنے لگے "جب میں تمہاری عمر کا تھا تو میرے پاس تین کابکیں تھیں اور ان تینوں میں کبوتروں کا ایک ایک جوڑا تھا"۔

"کابک کیا ہوتی ہے ابُو؟" میں نے معصُومیت سے پوچھا۔

"کابک اُس پنجرے کو کہتے ہیں جس میں کبوتر یا دوسرے پرندے رکھے جاتے ہیں۔ میں نے پالتُو کبوتر رکھنا تو ایک مدّت ہوئی چھوڑ دیا ہے مگر کبوتروں سے مجھے آج بھی پیار ہے۔ اِن کی دو باتیں تو مجھے بُہت ہی اچھی لگتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ اِن کے ذریعے پیغام رسانی کا کام لیا جا سکتا ہے اور لیا جاتا رہا ہے۔ دُوسرے یہ ہمیشہ اپنے ٹھکانے پر واپس پہنچ جاتے ہیں اور خراب سے خراب موسم میں بھی اپنا ٹھکانا نہیں بُھولتے، خواہ وہ کتنی ہی دور کیوں نہ ہو"۔

"وہ اپنا ٹھکانا کیسے معلوم کر لیتے ہیں ابُو؟" میں نے پُوچھا۔

"یہ تو میں نہیں جانتا بیٹے" ابُو نے کہا۔

"ابُو کی اس بات سے مجھے حیرانی ہوئی کیونکہ میں تو یہ سمجھے ہوئے تھا کہ ابُو دُنیا جہان کی سب باتیں جانتے ہیں۔ وہ کہنے لگے

"وہ کبوتری جو ان بچّوں کی ماں ہے ان کے لیے دانہ دُنکا لینے گئی ہے۔ ہم یہاں سے ہٹ جائیں گے تو وہ آکر اپنے بچّوں کو چوگا دے گی۔ تم دیکھنا چاہتے ہو انہیں ایک نظر؟"

"ہاں ابُو" میں نے شوق سے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"ابھی دکھاتا ہوں" ابُو نے کہا "لیکن ہمیں اِن سے ذرا فاصلے پر رہنا پڑے گا۔ انہیں ابھی اڑنا نہیں آتا۔"

ابُو نے ایک کرسی لا کر دیوار کے ساتھ لگا دی۔ اس کرسی پر کھڑے ہو کر انہوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں اُٹھا کر اُونچا کیا اور میں نے گھونسلے میں جھانکا۔ وہاں کبوتر کے دو ننّھے ننّھے بچّے پڑے تھے۔ صرف ان کے سر اور گردنیں دکھائی دے رہی تھیں، بدن گھونسلے کے تنکوں میں چُھپے ہوئے تھے۔ انہوں نے شاید ہمیں دیکھ لیا تھا یا شاید انہیں اپنے قریب اجنبیوں کی موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ اِس لیے وہ خاموش ہو گئے تھے۔ صرف آنکھیں جھپک رہی تھیں۔

"ابُو یہ کیا۔۔۔؟"

میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ ابُو نے سرگوشی کی "شش! خاموش۔ ایسا نہ ہو یہ ڈر جائیں۔ آؤ، اب چلیں۔ چند دن بعد پھر دیکھیں گے، جب یہ ذرا بڑے ہو جائیں گے"۔

یہ کہتے ہوئے ابُو نے مجھے نیچے اتار دیا اور ہم اندر چلے آئے۔

میں باورچی خانے کی کھڑکی سے اُس گھونسلے کو صاف دیکھ سکتا

تھا۔ کبوتری اپنی چونچ میں نہ جانے کیا کچھ لے کر آتی تھی اور دونوں بچّوں کو چوگا دیتی تھی ۔ مگر میں جب بے صبر سا ہو کر باورچی خانے کا دروازہ کھولتا تو ذرا سی آہٹ کے ساتھ ہی کبوتری اڑ جاتی تھی ۔ شاید اسے یہ بات پسند نہیں تھی کہ جس وقت وہ اپنے بچوں کو چوگا دے رہی ہو ، اس وقت آس پاس کوئی اجنبی موجود ہو ۔

اِن اجنبیوں میں صرف ہم ہی نہیں وہ بلّیاں بھی شامل تھیں جو کبوتروں اور ان کے بچّوں کو ہڑپ کر جانے کے موقعوں کی تلاش میں رہتی تھیں ۔ ابُو نے مجھے بتایا تھا کہ کبوتروں ، طوطوں اور دوسرے پرندوں کا شکار کرنا بلّیوں کی عادت ہے ۔

بلّیوں کی اِس عادت کے خیال سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے ۔ بلّی خاموشی سے آہستہ آہستہ دبے پاؤں بڑھتی ہے ۔ ذرا سے بھی آہٹ نہیں ہوتی ۔ نہ اسکی مُونچھیں ہلتی ہیں ۔ نہ دُم حرکت کرتی ہے ۔ وہ آہستہ آہستہ کبوتر یا کسی دوسرے پرندے کی طرف بڑھتی ہے ۔ اور پھر وہ چھلانگ لگاتی ہے ۔ اس کے ساتھ ہی پرندہ ختم!

ابُو نے تو مجھے کبوتروں کا گھونسلا دکھایا تھا ۔ مگر امّی نے مجھے بلّیوں کی چالاکی کی بہت سے کہانیاں سنائی تھیں ۔ اور جب بھی امّی کسی چالاک بلّی کی کہانی سناتی تھیں میرے بدن میں سنسنی سی دوڑنے لگتی تھی ، اور میں سوچنے لگتا تھا کہ کیا کوئی ایسی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ کبوتر اور دوسرے پرندے چالاک بلّیوں کا شکار بننے سے محفوظ ہو جائیں ۔ میں سوچتا تو بہت تھا مگر میرے ننّھے سے دماغ میں ایسی کوئی ترکیب آتی ہی نہیں تھی ۔

جس روز ابُو نے مجھے پہلی مرتبہ کبوتروں کا گھونسلا دکھایا تھا، اسکے چار پانچ روز بعد کی بات ہے ، سہ پہر کا وقت تھا۔ ابُو باہر گئے ہوئے تھے اور امّی گھر کے کام کاج میں الجھی ہوئی تھیں ۔ میں کبوتروں کے گھونسلے کے بارے میں سوچ رہا تھا ۔ میرا شوق اتنا بڑھا کہ میں سیڑھی اٹھا لایا اور اسے دیوار سے لگا کر اوپر چڑھنے لگا ۔ سیڑھی کے آخری ڈنڈے پر پہنچا تو گھونسلے میں دونوں بچّوں کو دیکھ کر اطمینان ہوا ۔ سیڑھی کچھ چرچرا رہی تھی مگر وہ دونوں بچّے اس آواز کو محسوس نہیں کر رہے تھے ۔ وہ اگرچہ کچھ بڑے ہو گئے تھے مگر اُڑنا شاید ابھی نہیں آیا تھا ۔ تاہم مجھے اِس اِحساس سے خوشی محسوس ہو رہی تھی کہ میں اِن ننّھے ننّھے کبوتروں کو اس روز کی نسبت اب زیادہ قریب سے دیکھ رہا ہوں ۔ بلکہ حقیقت یہ تھی کہ ان دونوں میں سے جو چھوٹا تھا ، اس کی نظریں مجھ پر اور میری نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں ۔ اتنے قریب سے تو ابُو نے بھی اِن ننّھے منّے

کبوتروں کو نہیں دیکھا تھا ۔

میں سیڑھی سے نیچے اترنے لگا تھا کہ ایک ایسی بات ہوئی جو میرے وہم و گُمان میں بھی نہ تھی ۔ چھوٹا بچّہ پھڑپھڑاتے ہوئے گھونسلے سے نکلا اور پڑوس کے مکان کی ڈھلواں چھت پر جا بیٹھا ۔ چھت کی ڈھلان پر پہنچے جانے کے لیے اسے کوئی جگہ نہیں مل رہی تھی ۔ اس لیے وہ پھسلتا ہوا چھت کے سرے پر آگیا ۔

پھر نہ جانے کہاں سے ایک بلّی نمودار ہوئی اور نیچے دیوار کے ساتھ آ کر بیٹھ گئی کہ وہ ننّھا سا بچّہ نیچے گرے تو وہ آرام سے اسے ہڑپ کر لے ۔ اس شکار کے لیے اسے کوئی بھاگ دوڑ کرنے یا گھات لگانے کی ضرورت نہیں تھی ۔ کبوتر کے بچّے کو چھت کی مُنڈیر سے لُڑھک کر سیدھا بلّی کے مُنہ میں آنا تھا ۔ میں یہ سوچ کر کانپ گیا کہ ابھی کوئی دیر میں یہ ننّھا مُنّا کبوتر جو ابھی اُڑنا بھی نہیں جانتا اِس ظالم بلّی کا لُقمہ بن جائے گا ۔ وہ ننّھا مُنّا کبوتر چھت کے سرے پر ٹکا ہوا اپنے ننّھے ننّھے پر پھڑپھڑا رہا تھا ۔

میں ایک دم تیزی کے ساتھ سیڑھی سے اُترا ، اپنے مکان کے زینے سے اتر کر نیچے آیا اور لکڑی کے بنے ہوئے اس اونچے جنگلے کی طرف بڑھا جو ہمارے مکان کو پڑوس کے مکان سے جُدا کرتا تھا۔

میرے ذہن میں ابّو کی باتیں گونج رہی تھیں ۔ میں نے اس ننّھے مُنّے کبوتر کو نہایت قریب سے دیکھا تھا جس سے وہ ڈر گیا تھا ۔ اب اگر وہ بلّی کا لُقمہ بن جاتا تو اس میں نہ تو اس کا قصور تھا اور نہ بلّی کا ۔ قصور میرا تھا ۔ اگر وہ ننھا منّا کبوتر بلّی کا لقمہ بن گیا تو اس کی ماں کو کتنا دُکھ ہو گا ۔ اس اِحساس سے میری طبیعت عجیب سی ہو گئی ۔

جنگلا میرے قد سے کہیں اونچا تھا مگر میں کسی نہ کسی طرح اُس پر چڑھ کر دوسری طرف کود گیا اور نیچے ایک جھاڑی پر جا گرا ۔ عین اسی لمحے وہ ننھا منّا کبوتر جو شاید پر پھڑپھڑاتے پھڑپھڑاتے تھک گیا تھا ، بے دم سا ہو کر نیچے گرا ۔ بلّی نے لپک کر اسے دبوچ لیا اور بھاگ کھڑی ہوئی !

"ہے ہی! چھوڑ دو اِسے ! چھوڑ دو اِسے" میں چلّاتا ہوا بلّی کے پیچھے بھاگا۔ بلّی ایک خاردار باڑھ کی طرف بڑھی اور جب اس نے اس باڑھ کو پار کرنے کے لیے اوپر کی طرف چھلانگ لگائی تو وہ ننھا منّا کبوتر اس کے مُنہ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑا۔ گرنے کے بعد اس نے کوئی حرکت نہیں کی ۔

"مر گیا بے چارہ!" ایک دم میرے دل میں یہ خیال آیا ۔ میرا سارا بدن پسینے میں نہا گیا تھا اور میں سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے بڑی احتیاط سے اٹھایا ۔ اس کی آنکھیں جھپک رہی تھیں اور سر بھی ذرا ذرا ہل رہا تھا ۔ اس سے مجھے اطمینان ہوا کہ مرا نہیں ابھی زندہ ہے ۔ میں نے ایک نظر اُس پر ڈالی ۔ اس کا ایک پنجہ بلّی کے مُنہ میں آکر ذرا کچلا گیا تھا ۔ اس کے علاوہ اسے اور کوئی زخم نہیں آیا تھا ۔ وہ زندہ تھا اور صحیح سلامت تھا ۔

خوشی کے مارے میں نے اسے اپنی چھاتی سے چمٹا لیا ۔ اس نے میرے ہاتھ سے نکلنے کی بالکل کوشش نہیں کی ۔ شاید اِس لیے کہ وہ بے حد تھکا ہوا تھا اور اس سے کہیں زیادہ خوف زدہ بھی تھا ۔

اب میں لکڑی کے اس جنگلے کی طرف بڑھا جسے میں تھوڑی دیر پہلے پھلانگ کر آیا تھا ۔ مگر اب مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ میں اِس جنگلے کو کسی طرح بھی پھلانگ نہیں سکتا ۔ مجبور ہو کر میں وہاں سے نکلا اور گلی کا پورا چکّر لگا کر اپنے مکان میں پہنچا ۔ دوسرے منزل پر پہنچ کر میں اس سیڑھی پر ایک بار پھر چڑھا اور اسکے آخری ڈنڈے پر پہنچ کر اس ننّھے مُنّے کبوتر کو دوبارہ اس کے گھونسلے میں رکھ دیا ۔ اسے گھونسلے میں رکھتے ہوئے میں نے پیار سے اس کے سر کو چُوما ۔ بدن پر ہاتھ پھیرا اور پھر نیچے اتر آیا۔ نیچے اتر کر سیڑھی واپس اسی جگہ رکھ دی جہاں سے اٹھائی تھی ۔ اور اس طرح امّی یا ابّو کو معلوم بھی نہ ہونے پایا کہ میرے اور اس ننّھے مُنّے کبوتر کے ساتھ کیا ماجرا پیش آچکا ہے۔ میں نے ابّو یا امّی کو اس بارے میں بالکل نہیں بتایا ۔ مگر اس کے بعد ہر روز دن میں کم از کم ایک بار ضرور ، اس گھونسلے کی طرف دیکھتا تھا۔ جب میں نے یہ دیکھا کہ کبوتری بڑے آرام سے اپنے دونوں بچّوں کو چوگا دے رہی ہے تو مجھے اطمینان ہو گیا کہ وہ ننھا مُنّا کبوتر ہر طرح ٹھیک ٹھاک ہے ۔

ابّو نے جب پہلی بار مجھے کبوتروں کا گھونسلا دکھایا تھا تو یہ بھی کہا تھا کہ ہم انہیں چند دن بعد پھر دیکھیں گے ۔ مگر انہوں نے دوبارہ کبوتروں اور ان کے گھونسلے کی بات ہی نہیں کی ۔ یوں بھی اُن کی مصروفیتیں اتنی زیادہ تھیں کہ انہیں کبوتروں کا دھیان آ ہی نہیں سکتا تھا ۔ میں نے بھی انہیں یاد دلانے کی ضرورت نہیں سمجھی ۔ مگر میں انہیں ہر روز کم از کم ایک بار ضرور دیکھتا تھا۔

بہار کا موسم گزرا اور پھر گرمیاں بھی گزر گئیں ۔ کبوتر کے وہ ننّھے منّے بچے اب خاصے بڑے ہو گئے تھے ۔ پھر جب خزاں کے موسم کے بعد سردیوں کا موسم شروع ہوا تو مجھے خیال آیا کہ اس سخت سردی کے موسم میں کبوتری اپنے بچّوں کے لیے دانہ دُنکا کہاں سے لائے گی ۔ یہ سوچ کر میں نے باورچی خانے سے روٹی کا ایک ٹکڑا لیا اور اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کر کے باورچی خانے کی کھڑکی کے نیچے بکھیر دیے ۔ اس کے بعد تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا کہ شاید کبوتری اور اسکے دونوں بچے آکر ان ٹکڑوں کو چُگ لیں ۔ مگر وہ نہ آئے تو میں کھیل کود میں لگ گیا۔

دوپہر کے وقت میں نے باورچی خانے کی کھڑکی سے نیچے جھانک کر دیکھا ۔ روٹی کے ٹکڑے غائب تھے اور فرش پر دو کبوتروں کے پنجوں کے نشان بنے ہوئے تھے ۔ ان میں سے ایک نشان ایک کُچلے ہوئے پنجے کا تھا جس سے مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ دونوں کبوتر آکر روٹی کے ٹکڑے چُگ گئے ہیں ۔

میں نے ان کبوتروں کو دوبارہ کبھی نہیں دیکھا ۔ مگر اس کے بعد کئی سردیوں تک میں نے جب بھی باورچی خانے کی کھڑکی سے باہر روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پھینکے تو دوسرے روز فرش پر دو کبوتروں کے پنجوں کے نشان پائے اور ان میں ایک نشان کُچلے ہوئے پنجے کا ضرور ہوتا تھا ۔

ہمارا وطن

سکردو

سُہیل اقبال

سرسبز اور بہتے دریاؤں کی وادی سکردو ، بلتستان کی سب سے بڑی وادی ہے ۔ یہ دریائے سندھ کے کنارے دریائے شگار کے ساتھ 2286 میٹر کی بلندی پر واقع ہے ۔ یہاں کی آبادی تقریباً 19 ہزار افراد پر مشتمل ہے ۔ یہاں کی زبان "بلتی" ہے ۔ جبکہ اردو ہر کوئی سمجھ اور بول سکتا ہے ۔ سکردو راولپنڈی سے تقریباً 853 اور گلگت سے 241 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے ۔

راولپنڈی سے روزانہ دو یا تین بسیں سکردو کے لیے روانہ ہوتی ہیں ۔ بس کا یہ سفر 17,16 گھنٹے کا تکلیف دہ سفر ہے ۔ مسافروں کی آسانی کے لیے اسلام آباد سے روزانہ دو یا تین ہوائی پروازیں بھی سکردو کے لیے روانہ ہوتی ہیں ۔ ان پروازوں کا انحصار موسم پر ہوتا ہے ۔ پرواز کا دورانیہ ایک گھنٹے کا ہوتا ہے اور کرایہ 160 روپے فی کس ہے ۔ سکردو کا ایئرپورٹ ، سکردو بازار سے 14 کلومیٹر دُور واقع ہے ۔ سکردو پہنچتے ہی سب سے پہلے آپکی نظر دھات کے بنے ہوئے ایک بہت بڑے عقاب پر پڑے گی ۔ جو کہ "چوک یادگار" میں ایک مینار پر نصب ہے ۔ یہ یادگار 1948ء کے اُن شہیدوں کے نام پر بنی ہے جنہوں نے ڈوگرہ راج سے بلتستان کے علاقے کو آزاد کرایا تھا ۔ مینار کے چاروں طرف اُن شہدا کے نام بھی لکھے گئے ہیں ۔

سکردو سے صِرف 8 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع سہ پارہ جھیل ہے ۔ جہاں آپ بذریعہ جیپ یا سوزوکی وین تقریباً 20 منٹ میں پہنچیں گے ۔ جھیل کا سارا راستہ بے حد خوبصورت ہے اور دریا راستے کے ساتھ ساتھ چلتا ہے ۔ دریا کی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا جب چہرے سے ٹکراتی ہے تو ایک عجیب طرح کی فرحت محسوس ہوتی ہے ۔ تقریبا 5 کلومیٹر کے فاصلہ پر آپ کو سکردو کا پن بجلی گھر نظر آئے گا ۔ جو تقریبا ۱۰۰ واٹ بجلی پیدا کرتا ہے ۔ یہاں پر پانی بہت بلندی سے گرتا ہے اور ایک دِلکش نظارہ پیش کرتا ہے ۔ ایسے ہی سہ پارہ جھیل خوبصورت برف پوس پہاڑوں میں گھری ہوئی بہت بڑی جھیل ہے ۔ جب ان برف پوش پہاڑوں کا عکس جھیل کے سبز و شفّاف پانی میں پڑتا ہے تو بہت ہی دلفریب منظر پیش کرتا ہے ۔ جھیل کے بیچوں بیچ ایک خوبصورت سا جزیرہ ہے جہاں کشتیوں کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے ۔ یہ جھیل ٹراؤٹ مچھلیوں سے بھری پڑی ہے ۔ اس لئے یہاں مچھلی کے شکاری بکثرت نظر آتے ہیں ۔ جھیل کی گہرائی تقریباً 3 سو میٹر ہے ۔

سکردو میں تقریباً 32 کلومیٹر کے فاصلے پر وادیٔ کچورا واقع ہے جسکی سطح سمندر سے تقریباً 2306 میٹر (7600 فٹ بلند ہے ۔ یہاں کی آبادی تقریباً 6 یا 7 سو افراد پر مشتمل ہے ۔ یہاں بھی ایک بہت خوبصورت جھیل ہے ۔ یہ گہری نیلی جھیل بھی بھوری ٹراؤٹ مچھلیوں سے بھری پڑی ہے ۔ یہ جھیل بھی شکار کے لیے بہترین جگہ ہے ۔

موسم بہار میں سکردو کے مناظر دِل کو موہ لیتے ہیں ۔ بہار میں یہاں رنگ برنگے پھولوں کی بہتات ہوتی ہے ۔ یہاں کے سیب ذائقے دار ہونے کی وجہ سے بہت مشہور ہیں ۔

سکردو کی ایک اور جھیل جو سکردو سے کافی نزدیک ہے "شنگریلا" جھیل کہلاتی ہے ۔ یہ کسی کرنل صاحب کی زرخرید ملکیّت ہے اور اس پر ہوٹل بنایا ہوا ہے ۔ اس کو شنگریلا ہوٹل کہتے ہیں ۔ دن کے وقت ہوٹل ، برف پوش پہاڑوں اور سرسبز درختوں کا عکس جھیل میں پڑتا رہتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے گویا اس کے اندر بھی یہی کچھ موجود ہے ۔ یہ منظر آنکھوں کو بہت بھلا لگتا ہے اور انسان کا دِل چاہتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لئے یہیں رہ جائے ۔

سکردو سمیت بلتستان کی پانچ وادیاں سکردو ، کچورا ، شگار ، خاپلو اور خیر منگ ہیں ۔

وادیٔ شگار دریائے شگار کے ساتھ ساتھ واقع ہے اور سکردو سے تقریباً 320 کلومیٹر دور ہے ۔ جیپ سے یہاں پہنچنے پر تقریباً 2 گھنٹے لگتے ہیں ۔ یہ خوبصورت وادی سطح سمندر سے 2286 میٹر (17500 فٹ) کی بلندی پر واقع ہے ۔ یہاں کی آبادی تقریباً ایک ہزار افراد پر مشتمل ہے ۔ اس کے علاوہ یہ وادی دنیا کی دوسرے نمبر کی بلند چوٹی K-2 اور قراقرم جیسی بلند چوٹیوں کا راستہ بھی ہے ۔ اس وادی میں جتنا بلندی پر جائیں مناظر خوبصورت سے خوبصورت ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ تمام وادی مونگ پھلی ، اخروٹ ، لوکاٹ ، آڑو ، خوبانی ، انگور اور سیبوں سے بھری ہوئی ہے ۔

شنگریلا جھیل، سکردو

دریائے شیوق

شنگریلا ہوٹل

وادیٔ خاپلو سکردو سے 103 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے ۔ اور یہاں جیپ کے ذریعے 2 گھنٹے میں پہنچا جا سکتا ہے ۔ یہ وادی دریائے شیوک کے کنارے واقع ہے ۔ یہاں کی آبادی 8 ہزار افراد پر مشتمل ہے ۔ یہ بھی سبزے اور پھلوں سے بھرپور وادی ہے ۔ یہاں سے کئی پہاڑی سلسلے دیکھنے کو ملتے ہیں ۔ مثلاً مشربوم ۔ K-6 ، K-7 ، شیرالی کانگھ ، سیاہ کانگری اور سالتورو کانگری وغیرہ ۔

سکردو کے مشرق میں ضلع لارکھ ، مغرب میں گلگت ، شمال میں چین کا صوبہ سنکیانگ اور جنوب میں انڈیا کا کشمیر واقع ہے ۔ یہاں پر دُنیا کا سب سے بڑا گلیشئر سیاہ چین بھی واقع ہے ۔ جو تقریباً 40 میل لمبا ہے ۔

آئیے خلا میں چلیں

اشرف نوشاہی

میں خلا میں اپنے پہلے سفر پر روانہ ہو رہا ہوں ۔ کیا آپ بھی میرے ساتھ چلیں گے؟ چلیں گے تو آئیے ۔ دیر نہ کیجیے ۔

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ خلائی راکٹ جہاں سے اُڑتے ہیں، اُس جگہ کو لانچنگ پیڈ کہتے ہیں ۔ ہمارا یہ لانچنگ پیڈ کراچی کے ساحل پر ہے ۔ ہم جس خانے میں بیٹھے ہوئے ہیں ، اُسے کیپسول کہا جاتا ہے اور ہم اس میں بیٹھے بیٹھے ایک ہزار میل کے مدار میں جا سکتے ہیں ۔ لیکن یہ ہمارا پہلا سفر ہے ۔ اس لیے ہم زیادہ دور نہیں جائیں گے ۔ تو آپ تیار ہیں ناں؟

لیجیے ۔ یہ لباس پہن لیجیے ۔ ڈریئے مت ۔ اسے "اسپیس سُوٹ" کہتے ہیں ۔ جی ہاں ۔ آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں ۔ تمام خلاباز ایسا ہی لباس پہنتے ہیں ۔ آپ نے خلائی سفر کی فلموں میں دیکھا ہو گا ۔ اس لباس کے اندر خود کار ائیر کنڈیشننگ سسٹم ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ پریشر سسٹم بھی ہوتا ہے ۔ یہ دونوں سسٹم خود ہی کام کرتے رہتے ہیں اور جب کیپسول میں ہوا کا دباؤ کم ہو جاتا ہے تو یہ ہمارے جسم کے گرد ہوا کا دباؤ قائم رکھتا ہے ۔ ایسا نہ ہو تو کم دباؤ کے باعث ہمارا خون اُبلنے لگے گا ۔ ارے! آپ کا تو منہ سوکھ گیا ہے ۔ آپ ڈر کیوں رہے ہیں؟ پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے ۔ آخر ایک پورا اِدارہ موجود ہے جس کے ماہرین نے ہر طرح کے اطمینان کے بعد اس سفر کی اجازت دی ہے ۔ اس لیے خواہ مخواہ مت ڈریئے ۔ اپنی سیٹ پر آرام سے بیٹھ جائیے، یہ بٹن دبائیے اور کمپیوٹر سے سفری ہدایات لیجیے ۔

"آپ لوگ مُسافرِ اوّل" کے ذریعے خلا میں جا رہے ہیں" کمپیوٹر کہہ رہا ہے "یہ ایک ایسا راکٹ ہے جس کے دو مرحلے ہیں اور جس کی قوت پانچ لاکھ پونڈ ہے ۔ جب راکٹ روانہ ہو گا تو بہت زور کی آواز آئے گی ۔ اِس کے علاوہ بہت زور سے اِرتعاش بھی ہو گا ۔ پہلے مرحلے کے دوران آپ اپنے وزن سے پانچ گُنا زیادہ کششِ ثقل محسُوس کریں گے ۔ جب یہ مرحلہ گُزر جائے گا تو آپ اِس کے الگ ہونے کی آواز سُنیں گے ۔ دُوسرے مرحلے کے ساتھ بھی ایسا ہی ہو گا ۔ اور جیسے ہی دوسرا مرحلہ گرے گا، آپ 25,600 فٹ فی سیکنڈ کی رفتار سے زمین کے گرد مدار میں داخل ہو جائیں گے ۔ یعنی تقریباً 17,500 میل فی گھنٹے کی رفتار سے گھومنے لگیں گے"۔ کمپیوٹر خاموش ہو گیا ۔

آپ اب سب کُچھ سمجھ گئے ہیں ناں؟ بہت خوب! آپ کا ائیر کنڈیشننگ سسٹم ٹھیک کام کر رہا ہے ناں؟ ٹھیک ۔ لیکن ابھی تک آپ کچھ پریشان ہیں ۔ اوہ! آپ کنٹرول کے بارے میں سوچ رہے ہیں ۔ آپ کے دائیں ہاتھ پر ایک تین محوری کنٹرولر ہے ۔ جی ہاں ۔ یہی ہے ۔ اس کو دائیں یا بائیں گھما کر آپ کیپسول کو گھما سکتے ہیں اور اوپر نیچے حرکت دے سکتے ہیں ۔ اِس محور کو دائیں یا بائیں گھما کر کیپسول کو جدھر جی چاہے گھما دیجیے ۔ اور دیکھیے، اس کے عین اُوپر ایک چھوٹا سا بٹن ہے ۔ جب آپ زمینی مرکز سے بات کرنا چاہیں، اِسے نیچے کر دیجیے ۔ جب یہ نیچے ہو گا تو آپ جو کچھ بھی کہیں

گے، زمین پر سُنا جائے گا ۔ پھر اِسے اُوپر کر دیں تو آپ زمینی مرکز کی آواز سُن لیں گے ۔

آپ کو بہت سے ڈائل اور انڈی کیٹر بھی نظر آ رہے ہیں ۔ یہ سب جس بورڈ پر لگے ہیں ، اسے "انسٹرومنٹ پینل" کہتے ہیں ۔ آپ کو یہ یاد رکھنے کی ضرورت نہیں کہ کون سا ڈائل کس کام کے لیے ہے ۔ جب بھی ضروری ہو، زمینی مرکز پر بیٹھے سائنسدان آپ کو بتائیں گے کہ کیا کرنا ہے ۔ پینل کے بالکل اُوپر سرخ روشنی بھی آپ کو نظر آ رہی ہے، جس کے نیچے لکھا ہے "خبردار!" اگر یہ روشنی بُجھ جائے تو زمینی مرکز آپ کو جو بھی ہدایات دے، اُن پر فوراً عمل کرنا ہوگا۔ ایسا کرتے ہی آپ ایک خودکار نظام کے ذریعے زمین کی طرف لوٹ جائیں گے ۔

لیجیے، روانگی کا وقت آگیا ۔ سب کچھ ٹھیک ہے؟ ۔ لیجیے، وہ ہینڈل بھی کھینچ دیا گیا ہے جس کے بعد ہم اِس کیپسول میں باقی دنیا سے کٹ گئے ہیں ۔ ذرا اُوپر دیکھیے ۔ وِنڈ اسکرین سے نیلا آسمان نظر آ رہا ہے ۔ تھوڑی دیر میں ہم اس نیلے رنگ میں داخل ہو جائیں گے ۔ ایک ایسے علاقے میں جہاں سورج کی شُعاعیں مُنعکِس کرنے کے لیے کوئی فضا نہیں ۔ ہر طرف تاریکی ہے ۔

خود کو سنبھالیے ۔ ہمیں جو لوگ خلا میں بھیج رہے ہیں، وہ اناڑی نہیں ہیں ۔ تجربہ کار سائنس دان ہیں ۔ انھیں معلوم ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں ۔ آپ کو بس اتنا کرنا ہے کہ اپنی آنکھیں اور کان کُھلے رکھیے ۔ یہ مت بُھولیے گا کہ زمینی مرکز سے بات کرنے کے لیے بٹن کو نیچے کرنا ہے اور اُس کی بات سُننے کے لیے اُوپر ۔

لیجیے ، کمپیوٹر ایک بار پھر بول رہا ہے "تیار؟ ٹھیک ہے ۔ لیجیے ہم چلے ۔ اُلٹی گنتی ۔ پانچ --- چار --- تین --- دو --- ایک --- اگنیشن --- خدا حافظ!"

سارا راکٹ تھرا اُٹھا ہے ۔ بہت زور کی آواز ہوئی ہے ۔ زمینی مرکز کی ہدایت سُنیے ۔ رفتار بتانے والے آلے (Velocity Indicator) کو دیکھیے۔

اوہ! یہ تو حیرت انگیز رفتار ہے ۔ ہم بڑی تیزی سے اوپر جا رہے ہیں ۔ 2500 --- 4000 --- 6000 --- 8000 --- 10,000 --- 12,000 فٹ فی سیکنڈ ۔ اب ہم صرف آنکھیں، اُنگلیاں اور کلائیاں ہلا سکتے ہیں ۔ اور یہ بھی بہت وزنی لگ رہی ہیں ۔ ٹانگیں، بازُو، معدہ اور سر اپنی اپنی جگہ بندھے ہوئے ہیں ۔ وزن بڑھتا جا رہا ہے اور ہمیں اپنی اپنی سیٹ کی طرف دھکیل رہا ہے ۔ زمینی مرکز کہ رہا ہے "سب ٹھیک ہے ۔ آسمان کی طرف دیکھو!"

آسمان پر ہلکا نیلا رنگ پھیکا پڑ رہا ہے اور آہستہ آہستہ سیاہ ہوتا جا رہا ہے ۔ اب شور بھی کم ہو گیا ہے ۔ اس لیے کہ پہلا مرحلہ الگ ہو رہا ہے ۔ ہمیں اپنا کیپسول اُوپر اُٹھتا محسوس ہو رہا ہے ۔ ستارے اُوپر کی طرف گرتے دکھائی دیتے ہیں ۔

ولاسٹی انڈی کیٹر کے مطابق اس وقت ہماری رفتار سولہ ہزار فٹ فی سیکنڈ ہے اور اِس میں بھی مُسلسل اِضافہ ہو رہا ہے ۔۔ اٹھارہ ہزار --- بائیس ہزار --- کششِ ثقل کم ہوتی جا رہی ہے ۔ ہمیں یُوں لگ رہا ہے جیسے ہم کسی ہاتھی کے پاؤں تلے سے نکل رہے ہیں ۔ آہستہ آہستہ ہاتھی کا پاؤں اُٹھ رہا ہے ۔ لیجیے، دوسرا مرحلہ بھی الگ ہو گیا ۔ اب ہماری رفتار 25,000 فٹ فی سیکنڈ ہے اور ہم زمین کے گرد مدار میں ہیں!

ہر طرف خاموشی ہے۔ ہم 17,500 میل فی گھنٹے کی رفتار پر زمین کے گرد گھوم رہے ہیں ۔ ہم سے زمین صرف ایک سو میل دور ہے ۔ تھوڑا سا آگے ہو کر باہر دیکھیے ۔ وہ افریقہ ہے ۔ شمال کی طرف کوہ الپس کی سفید چوٹیاں ہیں ۔ ہمارے نیچے، سو میل دور، یہ خوبصورت دنیا بھی گھوم رہی ہے ۔ جگہ جگہ بدلتے رنگ دیکھیے ۔ یہ اس لیے ہے کہ کہیں صبح ہے ، کہیں دوپہر اور کہیں رات ۔

لیجیے ، اب واپسی کا وقت ہو چلا ہے ۔ ایک بار پھر اُلٹی گنتی ہو رہی ہے --- چار --- تین --- دو --- ایک --- صفر --- اور یہ سب کچھ ایک دم بدل گیا ہے ۔ ایک زور دار آواز آئی ہے اور کیپسول کو جھٹکے لگے ہیں ۔ یُوں لگ رہا ہے جیسے ہم اپنی اپنی سیٹوں میں دھنس گئے ہیں ۔ ستاروں بھرا آسمان گرتا ہوا لگ رہا ہے ۔ ہم مدار سے نکل آئے ہیں اور گھر یعنی زمین کو واپس جا رہے ہیں ۔

ہونہار مصوّر

فوزیہ برلاس، ڈیرہ اسمٰعیل خان (پہلا انعام 100 روپے کی کتابیں)

صائمہ عنایت راولپنڈی (دوسرا انعام 75 روپے کی کتابیں)

شہباز انجم ہارون آباد (تیسرا انعام 50 روپے کی کتابیں)

سلیمان بھٹی باغ بان پورہ لاہور (چوتھا انعام 25 روپے کی کتابیں)

سید آصف رضا نقوی گڈو (پانچواں انعام 20 روپے کی کتابیں)

خرم بلال ملتان شہر (چھٹا انعام 15 روپے کی کتابیں)

ان ہونہار مصوّروں کی تصویریں بھی اچھی ہیں:

شہزاد احمد، فیصل آباد ۔ خیر محمد خان، کورنگی کراچی ۔ ناصر سلیمان میمن، کراچی ۔ محمد ثاقب قریشی، کراچی ۔ عدنان علی میرانی، سکھر ۔ اعجاز رسول، کراچی ۔ عظمیٰ کریم، پشاور چھاؤنی ۔ عبدالجبار شاکر، لاہور ۔ صدقات حسین میرانی، سکھر ۔ محمد زبیر ربانی، جہلم ۔ اختر رسول، کراچی ۔ مدیحہ بتول، کراچی ۔ افشاں کرم الٰہی، کراچی ۔ محمد صادق ریاض، سعودی عرب ۔ کامران خان، پشاور ۔ عشرت خالق، لاہور ۔ محمد بلال صادق، ملتان ۔ سیدہ صائمہ صدیق، راولپنڈی ۔ نفیس رضا میرانی، گڈو ۔ فیصل نواز، رحیم یار خان ۔ راشد عظیم، سرگودھا ۔ میاں مظہر اقبال، ملتان ۔ بلال خالد، لاہور ۔ محمد عرفان مجید، رحیم یار خان ۔ صباحت منہاس، لاہور ۔ ساجدہ سعید، میرپور آزاد کشمیر ۔ خضر حیات، میرپور آزاد کشمیر ۔ سید الطاف حسین زیدی، چنیوٹ ۔ علی محمود، سمن آباد لاہور ۔ ساجد حمید، لاہور ۔ عون محمد سعیدی، بہاول پور ۔ فارینا ڈار، لاہور ۔ اسد منیر، اسلام آباد ۔ سیمیں سعدیہ، ڈیرہ غازی خان ۔ عمران رضوان، سمن آباد لاہور ۔ راجا سعید افضل، جہلم ۔ شاہد اقبال، لاہور چھاؤنی ۔ نعمان نذیر، راولپنڈی ۔ راشدہ انجم، نازیہ حسین، دریا آباد راولپنڈی ۔

آپ ان موضوعات میں سے جس موضوع پر چاہیں تصویر بنا سکتے ہیں:

جولائی: مور اور مورنی (آخری تاریخ ۱۰ جون) اگست: برسات کی بہاریں

پاک و ہند کا
عظیم مسلمان
فرماں روا
شیر شاہ سُوری
اُس کا اصل نام فرید خان تھا وہ صوبہ بہار کے علاقہ سہسرام کے ایک پٹھان زمیندار قبیلے کا چشم و چراغ تھا۔
اُس نے جون پور میں تحصیل علم کیا۔ قدرت نے اسے توانا جسم اور بلا کا ذہن عطا کیا تھا۔ غیر معمولی شجاعت کی وجہ سے اُسے شیر خان کا لقب ملا اور بادشاہ بنتے ہی وہ شیر شاہ کہلوانے لگا۔
وہ سراپا طلسماتی شخصیت تھا۔ اس کے محیر العقل کارناموں سے یوں گمان ہوتا ہے جیسے وہ کوئی طاقتور جن تھا۔ پانچ سالہ دورِ حکومت میں عدل و انصاف امن و امان اور تعمیر و ترقی کا ایسا عمدہ نظام رائج کیا جس کی نظیر کہیں نہیں ملتی۔
عوام اُسے "سُلطانِ عادل" کے نام سے بھی یاد کرتے تھے۔ جہلم کے قریب قلعہ رہتاس اور جی۔ ٹی روڈ (شاہراہِ پاکستان) اس عظیم بادشاہ کی یاد دلاتے ہیں
عوام کو بنیادی سہولتیں مہیا کرنے والا پاک و ہند کا پہلا مسلمان بادشاہ

علاقہ سہسرام (بہار) میں سردار حسن خان بہت بڑا جاگیردار تھا۔ اُس کے ماتحت زمیندار اپنے مزارعوں پر اکثر ظلم کرتے اور
مال گزاری ادا کرنے سے اکثر انکار کر دیتے۔ سردار حسن خان نے اپنے بہادر بیٹے فرید خان کو ان لوگوں سے نپٹنے کا
حکم دیا۔ فرید خان نے دو سو گھوڑ سواروں کا دستہ لے کر اُن پر چڑھائی کر دی اور اپنی شجاعت ذہانت سے سب سرکشوں کو سیدھا کر دیا۔

مہاراج ! بڑے زمینداروں نے ہمارا جینا حرام کر رکھا ہے۔ ہمارا تمام غلّہ زبردستی اُٹھا کر لے جاتے ہیں۔

فرید خان ! اِن غریب مزارعوں کی فریاد سُنو! اور اُن سرکش زمینداروں کو سبق سکھاؤ کہ آئندہ وہ ایسی حرکت نہ کریں۔
بہت بہتر ابّا حضور ! ایسا ہی ہوگا۔ اِنشاءاللہ

فرید خان نے دو سو گھوڑ سواروں کا دستہ لیا اور باغی زمینداروں پر چڑھائی کر دی۔

غریب مزارعوں پر ظُلم کرنا کہاں کی انسانیت ہے؟ اور آپ لوگ مالگزاری بھی ادا نہیں کرتے؟

اب ایسی غلطی نہ ہو گی حضور!

واپسی پر ایک جگہ کچھ غریب مزارعوں نے فرید خان کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اور زمینداروں کی زیادتیوں اور لگان کی بے ضابطگیوں کے بارے میں اُسے حالات سے آگاہ کیا۔ اور اپنی مشکلات کے حل کے بارے میں اپنی اپنی تجویزیں پیش کیں۔

سیاہ گوش

یہ جانور پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے صحرائی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔ بہت ماہر شکاری ہے۔ زمین پر بیٹھے ہوئے پرندوں پر، جھاڑی کی آڑ لے کر جھپٹ پڑتا ہے، اور بعض اوقات نیچے اُڑتے ہوئے پرندوں کو بھی اُچھل کر گرا لیتا ہے۔
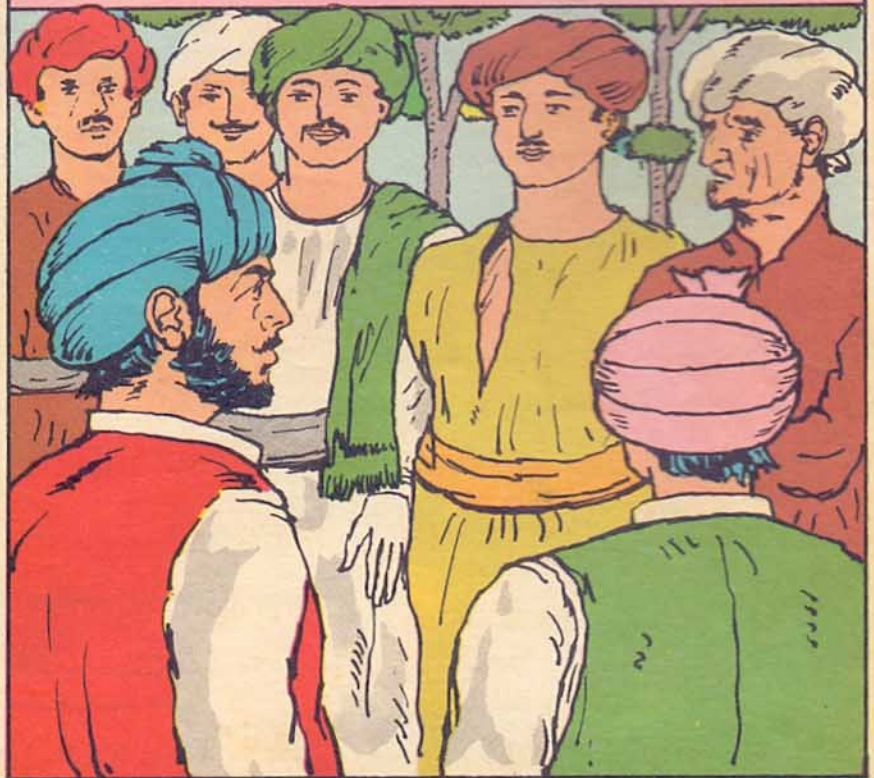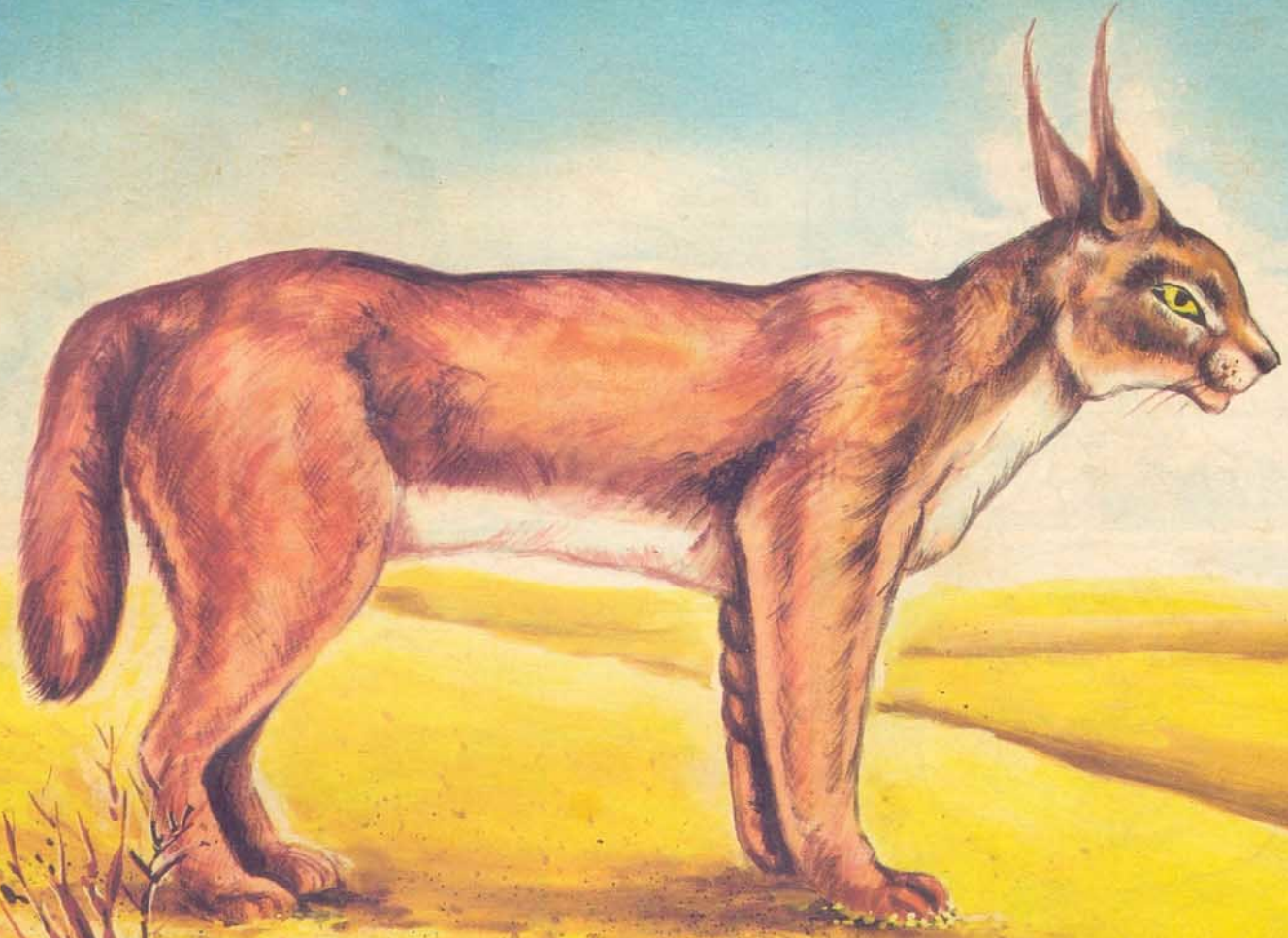
پرندوں کے علاوہ چنکارے، خرگوش، چُوہے اور چھپکلیاں بھی کھاتا ہے۔ زہریلے سانپ کا بڑی احتیاط سے مُقابلہ کرتا ہے۔ اِس کی مادہ دو سے چھ تک بچّے دیتی ہے، جن کی آنکھیں 9 دِن بعد کُھلتی ہیں۔ ماں تقریباً 5,6 ماہ تک بچّوں کو دُودھ پلاتی ہے۔

جنگلی حیات قومی ورثہ ہے

اس کی حفاظت کرنا ہمارا فرض ہے۔

The Taleem-o-Tarbiat, Lahore

R. L. NO. 4756 PAKISTAN'S MOST WIDELY READ URDU MAGAZINE FOR CHILDREN OF ALL AGES